

در شعر سہ کس پیمبر انند
فردوسی و انوری و سعدی

حیات فردوسی

مصنفہٗ

میرزا حیرت صاحب دہلوی ایڈیٹر کرزن گزٹ و مصنف تاریخ
محمدی و حیات طیبہ وغیرہ

جس کو باخذ حقوق
کارخانہ پیسہ اخبار لاہور نے شایع کیا

دوسری مرتبہ

سنہ ۱۹۰۲ع

میں

کارخانہ پیسہ اخبار کے مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور میں منشی عبد العزیز کے اہتمام سے چھپی

مقدمہ

نظم

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شائستہ لٹریچر میں تمام نظم کے عقلی فنون نقاشی۔ بت تراشی۔ موسیقی۔ علم فصاحت و بلاغت فن عمارت شامل ہیں۔ یہ تمام شریف فنون محض تقلید اور تتبع سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور نہایت وضاحت سے تشریح کرتے ہیں۔ مگر بت تراشی۔ نقاشی۔ موسیقی۔ فن عمارت کی تکمیل میں زمانہ مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک اپنی عمر کا گراں مایہ حصہ ان میں نہ صرف کر دیا جاوے کبھی انسان مسند تکمیل پر جلوہ افروز نہیں ہوتا۔ اصل میں کمال کا نام کامل علم یا فن کا آجانا ہے۔ بعض وقت اوچھے شخص کو ایسے علم اور فن میں کامل کا لقب ملجاتا ہے جو اس شہر میں جس کا وہ رہنیوالا ہے کوئی اتنا بھی جاننے والا نہیں ہوتا۔ مگر یہ محض ایک عارضی بات ہے جو مدت تک اس کی ذات کے ساتھ قیام نہیں کرتی اور بہت جلد زمانہ دودہ کا دودہ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھا دیتا ہے۔ میں نے اس غرض سے فنون کو نظم اور علم فصاحت و بلاغت سے جدا کر لیا ہے کہ بالکلیہ ان کا انحصار ضمیری قابلیتوں پر موقوف ہے۔ اس شریف علم میں نہ تقلید کی ضرورت ہے نہ تتبع کی حاجت بلکہ زیادہ تر یہ روحانی پاک جذبوں اور ضمیری جوہر و نکات کا محتاج ہے اس کے مذاق کی خصوصیات سے ممتاز اور سب میں شامل ہے جس پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

اگر وہ ہیچ جاندار می جائے
بوالعجب ماندہ ام کہ ہر جائی

تمام جہان کا مذاق ایک ترقی پذیر اور شائستہ قوم سے مجہول اور ناتربیت یافتہ نیش تک اسی سے وابستہ ہے۔ سب اس کی فدائیت اور فریفتگی کا دم بھرتے ہیں۔ اور چاروں طرف سے یہی صدا آتی ہے۔ شعر

گر برسر و چشم من نشینی　　نازت بکشم کہ ناز نینی

علم صنائع و بدائع یا علم معانی اور علم فصاحت و بلاغت یہ ایسے وسیع اور لا محدود علوم ہیں۔ کہ جن کی نہ کسی قوم میں حد ہے۔ نہ کسی خاص زبان کے لئے خصوصیت ہے ان مذکورہ بالا علوم کی روحانی چسپیدگی اور لاثانی وابستگی اس بلا کی طبائع کو ہے جس کا اندازہ کرنا ایک لاینحل مسئلہ کے حل کرنے کے لئے سوچنا ہے۔ یہ علوم شائستگی کے بہت بڑے زیور تسلیم کئے گئے ہیں اور نیچر نے ان میں کوٹ کوٹ کر سحر بھرا ہے۔ لیکن یہ نظم کے فرمانبردار بندے ہیں۔ نظم ہی کی وجہ سے ان کی بقا ہے اور اسی کے صدقہ میں ان کی یہ دھوم دھام ہے۔ نظم ان مذکورہ صدر علوم کو ان کی حقیقی اور اصلی صفات کا جامہ پہنا کر مسند شائستگی پر بٹھاتی ہے۔ تاکہ مجرائی جھکیں اور دیدار سے مشرف ہوں۔ نظم کا لہلہاتا ہوا نازک پودا زمین آسائیش سے پھوٹا۔ اور بڑا ہوا۔ اور اس میں متحقق شادمانی کے عطر بیز پھول لگے اور اسی طرح علم فصاحت اور بلاغت کا بیج زمین حاجت سے پھوٹا اور اس میں تیقن کا پھل لگا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نظم کا پودہ زمین آسائش سے پیدا ہوا تو ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ القاء ربانی اور الہام غیبی کی کیفیت ضرور ضمیری جوہروں کے ساتھ دست و گریبان ہو کر نظم کی صورت میں ہویدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لازم آیا کہ نظم کا تعلق براہ راست مذہب سے ہو۔ اور اس میں الٰہی برکتوں کا نورانی ہیز پرتو جگمگائے۔

انسانی ابتدائی زمانوں میں اور فطرت کی اصلی حالت میں جب ہم ایک غور میں نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ ہویدا ہوتا ہے کہ انسانی ضمیر جب بھی بلند بلند خیال اور باریک نکات سے آراستہ تھی اور اس میں ایسی اعلےٰ درجہ کی قابلیت بھری ہوئی تھی کہ اگر اس کو

ترقی کے کینڈے پر ڈالا جاتا اور اُس کے ذاتی جوہروں کے ابھارنے کے لئے لائق تدبیریں کی جاتیں تو ضرور ان سے لاثانی قابل نتائج برآمد ہوتے۔ فطرت کبھی بخیل نہیں ہوئی اور جو کچھ اس نے بخشا فراخی اور کشادہ دلی سے بخشا اور ہر زمانہ ہر موسم ہر ملک۔ اور ہر قوم میں اپنی فیض بخش برکتیں بلا امتیاز و تفریق ملت و قوم الوالعزمی سے پھیلائیں اور ان کو کافی وسعت دی۔ جس نے قدر اور وقعت کی نگاہ سے اس کی فیاضانہ بخشش کو دیکھا اس نے بہت کچھ برتری اور افضلیت بزرگی کے خزائن جمع کر لئے اور جس نے اپنی غلط فہمی یا بےعلمی سے اُس بیمثال فیضان کو دیکھا زمانہ نے اِسے سخت مذلت میں پھنسا کر وحشت اور جہالت کے ہمکنار کر دیا نیچر کی انمول بخشش اور بیمثال فضیلتیں اِن عظیم الشان اور ششدر کرنے والے منظروں میں مضمر ہیں جو شب و روز ہماری آنکھوں کے آگے ہوتے ہیں۔ جن سے ہم نے بہت کچھ علمیت کا خزانہ جمع کیا ہے اور شب و روز کرتے ہیں۔ نظام عام کے بینظیر تھیٹر اور فطرت کی کُل بڑی بڑی قوتوں کا کائنات کی اسٹیج پر ایکٹ کرنا مُبصر کی نگاہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ انہیں متحیر نظروں سے تکتا ہے اور منظر کا اثر اس کے ضمیری جوہروں کی لوح پر گوناگون نقش و نگار میں پڑتا ہے۔ اس کا ضمیر نئے نئے خیالات کا انبار جمع کرتا ہے اور ان میں روزمرہ تغیر و تبدل کر کے ہمیشہ نئے نتیجے پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ خیالات یا مختلف عظیم الشان منظروں کے عکس نئے نئے لباس اور عجوبہ رنگوں میں معلوم ہوتے ہیں۔ کسی خیال کا رنگ وحانی جذبوں کا پرجوش لباس زیب کئے ہوتا ہے اور کسی خیال کی صورت ششدر اور متحیر کرنے والی ہوتی ہے اور کوئی خیال اپنے ساتھ شادمانی اور استراحت کا سرمایہ رکھتا ہے۔ کسی خیال میں خطرناک خوف کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل یہ مختلف قسم کے خیالات کیا ہیں صرف فطرت کی لاثانی عظیم الشان قوتوں کا تماشہ گاہ عالم میں کائنات کی اسٹیج پر خوبصورتی سے ایکٹ کرنا ہے۔ ان قوتوں کے ایکٹ کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی اور باہمی ربط کا ہو بہو نقشہ یا اس کا سچا فوٹو محض نظم کی ترقی اور

اس کے ساتھ صنائع بدائع اور علم فصاحت اور بلاغت کے وسیع ہونے نے کھینچکو ہماری آنکھوں کے آگے بٹھا دیا۔ اور جبر اہم سے تعریف کرادی۔ آفتاب کا کس آب و تاب سے طلوع ہونا اور کن حسرت بھری کرنوں اور خونی صورت سے غروب ہونا روز مرہ ایک نئی دلچسپی دیتا ہے۔ حالانکہ ہم ہزارہا بار دیکھ چکتے ہیں لیکن اسکی قدیمی گردش اور طلوع و غروب میں وہ لطف آتا ہے جس سے یہ قول عاید ہو کہ کل جدید لذیذ۔ فطری طور پر اسکے دونوں منظر ہمیشہ نئی دلچسپی دیتے ہیں۔ اندھیرے اجالیکا عجیب تر انقلاب چاند کے روشن دائرہ کی درخشانی۔ تابانی۔ اور اس کا تغیر و تبدل آسمانی شامیانہ کی ستاروں کی جگمگاتی ہوئی قندیلوں سے آراستگی یہ چیزیں اور یہ خوش منظر تو تعجب اور تحیر کے نقوش لوح دل پر کندہ کرتے ہیں۔ اور ان سے ضمیری جوہروں کی خیالی دوڑ میں انتہا درجہ کا حیرت افزا تماشہ پیدا ہوتا ہے اور ہر سو حیرت و استعجاب کا ہی سرچشمہ اُبلتا معلوم ہوتا ہے۔ اور القائے ربانی کے طور پر ضمیر میں یہ گذرتا ہے اور خود بخود اس کیفیت کا جام طبیعت سے چھلکنے لگتا ہے اور از خود زبان سے یہ سرزد ہونے لگتا ہے +

اے عظیم الشان ذو الجلال علم و دانش کے روشنی پھیلانے والے چشم دنیا۔ اس روشنی کے سرچشمہ جو میرے قدموں کی راہنمائی کرتی ہے۔ اس گرمی کی مجموعہ جو مجھے ایسی حالت میں گرم کرتی ہے جب میں سردی میں ٹھٹھر جاتا ہوں۔ تیرے ہی اثر سے نیچر کا چہرہ پسندیدہ دلکش اور تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا تو ہر شام ماندہ ہو کر تاریکی میں آرام لیتا ہے؟ پھر تو کہاں سے ہر صبح اپنی از سر نو تابندگی بہ جلال نور سے طلوع ہوتا ہے؟ اور تیرے جلال میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی؟ کیا تو حکمران نہیں ہے؟ کیا تو عالم کا پیدا کنندہ خالق مطلق اس خوشنما منظر کا جو مجھے دکھائی دیتا ہے نہیں ہے؟ میں سجدہ کرتا ہوں تیرے آگے مثل تیرے بچہ یا تیرے خادم اور تیرے غلام کے تجھ سے مستدعی ہو کر۔ میں تجھ سے تیری سی حفاظت کی استدعا کرتا ہوں اور تیری نیکی کی مداومت چاہتا ہوں مجھے

تنہا نہ چھوڑ دیو کہ سردی مجھے اڑا لے۔ یا گپ گھپ گھپ ٹوئیاں مارتا پھروں۔ اپنی مقررہ غیر موجودگی کے بعد واپس آ۔ واپس آ۔ دیکھ ہاں کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں ؂

ندیدہ رفتی و مردم ہماں نفس فریاد
کہ بے تو مردم و آنگہ چنیں بآسانی
کسے کہ تشنہ لب نار سنت میداند
کہ موج آب حیاتست چین پیشانی

اپنے آگے سے ان غلیظ دھندلے بادلوں کو ہٹا دے جنہوں نے نیچر کے چہرہ کو تیرہ و تار کر رکھا ہے۔ پرند چہچہانے لگے ہیں۔ اور ہر جانور تیرے آنے کی کتنی خوشی کر رہا ہے نہ صرف جانور بلکہ درخت۔ سرسبز پودے اور پتہ پتہ کیسا خندہ معلوم ہوتا ہے۔ اور تیرے آنے سے چہرے کیسے بشاش نظر آتے ہیں۔ تو ہی ہے اے نور تجلے کے سرچشمے ہمیں نور بخشنے والا۔ ہر شخص تیرے آنے سے اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تیرے ہی صدقہ میں روزی پیدا کرتا ہے"

نقاب چہرۂ روشن سے جب اٹھاتا ہے
سحر ہر ایک کو ہر کام میں لگاتا ہے
کوئی حرم کو کوئی بت کدہ کو جاتا ہے
کوئی تلاش معیشت میں جی کھپاتا ہے
جو پوچھا میں نے تو اے دل کدھر کو جاتا ہے
تو بھر کے آنسو یہ مصرعہ مجھے سناتا ہے
علی الصباح جو مردم بکار و بار روند
بلاکشان محبت بکوئے یار روند

اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ وحشی قوم میں بھی نظم اور فصاحت اور بلاغت اور صنائع وبدائع کا خرچ مذہبی گیتوں اور دینی عبادتوں میں بکثرت ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا جملے جس میں آفتاب کو خدا مانا گیا ہے ایک سورج پرست کے ہیں جو حضرت عیسیٰ سے تین صدی پہلے ہمالیہ کے دامن میں کھڑا ہو کر یہ عبادت کیا کرتا تھا۔ اس سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ نظم القاء ربانی اور الہام غیبی ہے کہ جواز خود طبائع میں پیدا ہوتی ہے مگر جب وہ زبان یا قلم سے ظہور میں آتی ہے تو ضمیر اور دل کے سانچہ میں ڈھلتی ہے۔ اس کی خوشنمائی ضمیری سانچہ کی عمدگی پر موقوف ہے۔ مادہ وہ ہمیشہ نیچر کی طرف سے ضمیر کے سانچہ میں ڈالا جاتا ہے لیکن بدنمائی سے ڈھلنے کا گناہ فطرت کی بخشش کا نقصان یا اُس کی خامی نہیں ہو سکتی بلکہ سانچہ کی مکروہ صورت کا یہ سارا قصور تسلیم کیا جا سکتا ہے +

ایسی حالتوں میں کہ جب ربانی محبت کا جوش دل میں اُبلتا ہے تو اپنے اپنے عقائد مذہب کے موافق ضرور ہر قوم اپنی معاشرت رسم ورواج۔ عادات۔ وصفات۔ قوانین۔ اور مذہب میں دخل دیا کرتی ہے۔ اور نظم کا ایسے موقعہ پہ دخل ہر متنفس کو پسندیدہ معلوم ہوتا ہے مثلاً اب قدیمی مصری اپنے خدا آپس نامی کی عید میں ناچتے اور اس کی صفت وثنا میں اپنے شعرا کی موزوں کی ہوئی نظمیں پڑھتے تھے۔ یونانیوں کے ہاں جب کوئی مذہبی تقریب ہوتی تھی اور وہ علاوہ پرشاد چڑھانے قربانی کرنے اپنے خداؤں کے پیروں میں ناک رگڑنے کے ناچتے تھے گاتے تھے اور بڑے بڑے نامی یونانی شعراء کی نظمیں اپنے دیوتاؤں کی تعریفوں میں پڑھتے تھے۔ اور پھر گویا یہی جگہ بطور مشاعرہ کے سمجھنی چاہیئے۔ یہ طریقہ نظمی عبادت اور رقص وسرود کا یونانیوں نے مصریوں سے لیا تھا۔ رومتہ الکبرے کے باشندے بھی اپنے راہ نماؤں اور مقتداؤں کے ساتھ رومتہ الکبرے کے شاہراہوں میں ناچتے اور گاتے ہوئے نکلتے تھے۔ وہ کوئی عاشقانہ غزل نہ گاتے تھے بلکہ مذہبی گیت بچہ بچہ نہایت جوش وخروش میں پڑھتا تھا اسرائیلی بھی اپنے ان مذہبی گیتوں اور مذہبی تقریبوں میں ناچنے اور گانے میں بہت مشہور ہیں مریم بنت ہارون کی بہن مردنگ ہاتھ میں لے

لیتی اور کل عورتیں اسے دیکھ کر مردنگ اور طبلے لیکر ناچنے اور گانے بیٹھتیں اور وہ انہیں کہتی۔ گاؤ اے عورتو خداوند کی توصیف اور حمد کا گیت گاؤ حضرت داؤد اپنے خدا کے آگے خود ناچے اور گائے ہیں حضرت داؤد خود بہت سے بھجنوں کے مصنف ہیں جو وہ نہایت جوش میں آکر جھوم جھوم کر گایا کرتے تھے۔ برطن اور گال میں بارڈ کی نظم میں بہت بڑا حصہ مذہبی بھجنوں کا ہے۔ گو تھس بھی سال میں دو بار مذہبی تقریبیں کیا کرتے تھے جن میں سوائے رقص وسرود اور بھجن گانے کے کچھ بھی نہ ہوتا۔ عرب اشاعت اسلام سے پہلے بانسلی میں اپنے دستی خداوند کی حمد لہک لہک کر گاتے تھے۔ سننے والے ناچتے تھے اور اکثر وجد انگیز مگر نامبارک جذبوں کے ساتھ اُن کے شور وغل سنائی دیتے تھے۔ مسلمان پانچوں وقت بہت دھوم دھام سے سچے پر جذبہ جوش وحدت میں بھری ہوئی حالت میں اپنے خدا کی حمد ایک جماعت کے ساتھ وقت مقررہ پر کرتے ہیں اُسے سجدہ کرتے ہیں اور اُس کے جلال کی صفت وثنا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں +

"حمد تیرے ہی لئے ہے اے عالموں کے رب۔ اے رحمت بھیجنے والے تو ہی قیامت کے دن کا مالک ہے۔ تیرے ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں تو مجھے سیدھی راہ دکھا۔ اُن لوگوں کی جن پر تیرا غضب نازل نہ ہوا ہو"

پانچوں وقت دنیا کے ہر ہر گوشہ سے یہی موسیقی خیز آواز نظم قرآنی کا جامہ پہنکر بلند ہوتی ہے اور اثیما سفر میں جاکر گونجتی ہے اور پھر عجیب دلکش خلوص نیت اور برحق عقیدتمندی کا دل لبھانیوالا سماں معلوم ہوتا ہے +

چینی اپنی مذہبی انجمنوں کو موسیقی آنوں اور نفیس نفیس نظموں سے آراستہ کرتے ہیں تاتاری۔ سیموئی دس۔ لیپ لینڈرس۔ جبشی۔ کافر۔ ہوٹن ٹوٹس اپنی عبادت بھجنوں اور ناچوں پر منحصر جانتے ہیں۔ نظم ایک مرکب ہے کہ جس پر تمام قومیں سوار ہو کر ربانی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں +

نیچر نے نظم کو اسی لئے مخلوق کیا ہے کہ وہ انسان کے ہر کام میں مدد دے اور یہ
اس کے باریک خیالات اور لطیف تصورات کے اظہار کا ایک آلہ ہے۔ جب ایک
ذہین طباع فہیم لائق ضمیر اعلےٰ درجہ کے جوہروں سے پیراستہ نظم کی طرف متوجہ ہوتا ہے
اور اس شریف فن میں پورا اور قوی درک پیدا کر لیتا ہے اور اس کے ہمعصر فضلا کی
وقعت کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو جو کچھ یہ شخص چاہے قوم کی اصلاح کر سکتا ہے اور
اس کی حالت کے ساکن سمندر میں تموج پیدا کر سکتا ہے اور کسی سے اتنی اصلاح نہیں
ہو سکتی۔ فطری طور پر نظم کا اثر انسانی طبیعت پر نثر سے زیادہ ہوتا ہے اور ہر کان
وحشی سے وحشی اور عالم سے عالم کا منظوم سننے کو جی چاہتا ہے۔ جب اس کے کان
میں اس کی دلچسپی کا وہ شعر پڑا اور وہ رقص کرنے لگا خواہ جسمانی رقص کرے یا روحانی۔
وجد انگیز خوشی ضرور ہی پیدا ہو جاتی ہے اور جو روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں
اُن کا ذکر نہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ نظم میں بہت بڑی قوت
رکھی گئی ہے اور جو کچھ سحر وجادو مشہور ہے وہ نظم ہی کا ایک جزو سمجھنا چاہیے
تیز طبع اور بلند خیال شعرا نے نظام فلکی پر بھی اپنے خیالات کے وسیع ہاتھ پیر دل
کو پھیلا دیا ہے اور ہر سیارہ کی نسبت انوکھی نئی نئی باتیں قائم کی ہیں۔ ع

آندھی کی طرح آئی طبیعت جدھر آئی

جس طرف جھکے اُسے انتہا تک پہنچا دیا بلکہ اُس سے بھی آگے بڑھا دیا۔ مثلاً مشتری
ناہید، یا اولی فلک۔ مریخ عاشق مزاجاں فلک کے لئے۔ زنا کاری۔ مباشرت
ہمبستری کو پاک قرار دیدیا۔ عطارد کیلئے چوری کو خاص کر دیا۔ اسی طرح مختلف سیاروں
کے لئے نئی نئی باتیں قرار دیں۔ کسی کو شرابی بنا دیا اور کسی کی صفت بیرحم قرار
دیدی۔ یہ خیالات ان لوگوں کے نہ تھے کہ جو معمولی تھے۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے کہ
جنہیں عقل و دانش کا حصہ ملا تھا وہ اپنی قوم کے مصلح تھے۔ اُنہوں نے نئے نئے
شہروں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُنہوں نے نئے نئے قوانین اپنے ملک اور قوم کے
لئے منضبط کئے تھے۔ اِن کی تہذیب نے ابنائے جنس پر شائستہ اور قابل مدح

اثر کیا تھا۔ بااین ہمہ اُنہوں نے ہر سیارہ کے ساتھ ایک خاص صفت مخصوص کر دی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے پرانے مذہب تھے سب میں یہ عقیدہ تھا کہ جو کچھ نیکی بُرائی ہم پر عائد ہوتی ہے یہ صرف سیاروں کی گردش کی وجہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر سیارے اور ستارے کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ مثلاً ڈائینا کو بیرحم تسلیم کرتے تھے اِس لئے انہیں لازم آیا کہ وہ اس کی پرستش کریں تاکہ اُن پر وہ اپنی مہربانی رکھے اور ظالمانہ پنجے دراز نہ کرے۔ اس کو جان بوجھکر اور یہ دیکھ کر کہ اس کا اثر مخلوق پر اچھا نہیں پڑتا بے رحم قرار دیدیا۔ آہ صاف ثابت ہو گیا کہ سیاروں کا نام اور اُن کی صفت مذہبی پہلوؤں سے قایم کی گئی تھی۔ یہ صفتیں قایم کر کے اُن کو فصیح اور بلیغ نظم میں موزوں کر لیا گیا تھا اور وہ شب و روز مذہبی انجمنوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ جو صفتیں کہ دیوتاؤں کی مانی جاتی ہیں یہ سب شعرا ہی کی قرار دی ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے مذہبی بنیادوں کو دلوں میں جما دیا اور آپ گویا اپنی قوم اور ملک کے آئینہ بن گئے جن میں سے ہم ان کے ابناء جنس کی معاشرت۔ عقائد۔ اور مذہبی جوش کا صاف صاف فوٹو دیکھ سکتے ہیں۔ آو ایک نظر ہی سود د) کی نظم پر ڈالیں جس میں بالکل دیوتاؤں کی اصل نسل کا بیان ہے۔ اس فاضل شاعر نے اپنے اس نئے مضمون میں کس قدر طبیعت کا زور دکھایا ہے اور اپنے ابنائے جنس کے مذہبی خیالات کو دیوتاؤں کی اصل نسل بیان کر کے کس قدر وسعت دی ہے۔ اس سے شاعر کی قوت کی نسبت یہ کہ سکتے ہیں کہ اسے القائے ربانی ہوتا تھا کہ جس نے اس کی زبان اور اس کی قلم میں یہ تاثیر رکھی تھی پھر ہومر) کے علم الٰہی کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں جس نے علم معرفت کو در حقیقت چمکا دیا اور جو بہت بڑا معرفت دان ہوا ہے۔ اس کی کل نظم سے اس کی قوم کے خیالات ان کے مذہبی عقائد معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے پاک اور نِتھرے ہوئے خیالات کی روانی اور اعلےٰ درجے کے مضامین کو نظم میں موزون کرنے کی لیاقت نے تمام دنیا میں اس کا ڈنکا بجا دیا اور وہ بیشمار مقولے جو صد ہا شعرا کے خاص سبب سے تمام جہان میں پھیلے اور جو

ابتک روحانی تشنوں کی پیاس کو برابر بجھا رہے ہیں کس قدر قدر و قیمت کے قابل ہیں انسانی
نسل ان مقولوں سے اپنی روحانی خوشی کی بقا تصور کرتی ہے اور اپنے بزرگوں کے
کارنامے اسی بحر میں پڑھتی ہے اور ان سے وجد انگیز سرور حاصل کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے
کہ شعرا کے تمام خیالات فیکٹس پر مبنی نہیں ہوتے ہیں۔ تاہم یہ نازیبا امر ہے کہ ہم ان کے
استعارات تشبیہات اور مبالغہ کی چاشنی پر جو ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے اعتراض
کریں اور شاعر کو لغو گو قرار دیں۔ یہ سخت بے انصافی ہے ہم جب کسی نظم کو دیکھتے ہیں تو
یہ سمجھ کر نہیں دیکھتے کہ ہم تاریخ دیکھ رہے ہیں۔ یا کسی قسم صنائع بدائع کا نام نہیں ہے۔
بلکہ شاعرانہ خیالات کا ایک انبار ہے جس میں علاوہ فیکٹ ہونے کے اُن کا زیور بھی ضرور
ہوگا۔ اور وہ زیور صنائع بدائع ہیں۔ تشبیہات ہیں۔ مبالغہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ افلاطون
نے اپنے کامن ویلتھ میں سے ہومر کو صرف اُس جرم میں کیوں خارج کر دیا۔ کہ اس نے اپنے
دیوتاؤں کی ناواجب مدح و ثنا کی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہومر نے ایسی مدح
وثنا کی ہے کہ جو انسانی مخلوق کے اخلاق کو صدمہ پہنچانیوالی ہے۔ تو بیشک افلاطون
کا اعتراض بہت ٹھیک ہے۔ اور اگر اسکی صفت و ثناء سے اخلاق اور معاشرت پر
بڑا اثر نہیں پڑتا تو افلاطون کا اعتراض ناواجب ہے۔ اگر ہم اس تصنیف کو جو ہمیں ہومر
کی دستیاب ہوئی ہے۔ ایک نکتہ چین نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہومر کے خیالات
نہایت شائستہ اور نکھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی بیہودہ نمایشی تو نہیں ہے۔
کہ جو انسانی مخلوق کو خراب کرے ان کے اخلاق بگاڑے اور ان کے ضمیری جذبوں کو
ناپاک کرے۔ ہم افلاطون کی جانچ اور تردید پر کوئی قطعی رائے نہیں قائم کرسکتے لیکن
اس قدر ضرور کہ سکتے ہیں کہ خواہ افلاطون کا یہ ریمارک ہومر کی نسبت صحیح ہو لیکن اس
میں شک نہیں کہ ہومر شعرائے متقدمین کا باوا آدم ہے اور اس سے کسی نے بھی
انکار نہیں کیا ہے۔ ہومر پر کیا مقرر ہے اور صدہا شعرا نے اپنے اپنے دیوتاؤں
کو خونی لباس پہنا کر خوش کیا ہے۔ ان کے طیش انگیز غصہ کی آفت خیز گرمی کا نقشہ
کھینچا ہے۔ ان کے خونریز جنگوں کا غضب انگیز ذکر کیا ہے۔ ان کے دھواں

دہر طاقتوں اور قضیوں کا فوٹو اتارا ہے۔ اِن کے قہرانگیز مجادلونکا حسرت ناک بیان کیا ہے۔ اور اِن کے اِن خوفناک اور دل کے دہلا دینے والے زخموں کا خاکہ اتارا ہے کہ جو اِن کے حملوں سے دشمنوں پر پڑے تھے یا وہ خود اِن سے مجروح ہوئے تھے علاوہ اِن خون آلود بیانوں کے شعرائے دیوتاؤں کی مخاصمت۔ اِن بن اور قضیوں کے نسبت بھی بہُت دھوم دھام سے تحریر کیا ہے اور اِن تمام باتوں کا ایک عجیب و غریب سین کھینچکر دکھایا ہے۔ جس کی نظیر دوسرے زمانہ میں نہیں دکھائی دیتی۔ شعرائے مذکورہ بالا نے انھیں باتوں پر قناعت نہیں کی بلکہ دیوتاؤں کی زندگی اور موت کا بیان بھی خوب شرح و بسط سے لکھا ہے۔ اِن کی دردناک شکایتوں اِن کے تضرع نالہ و بکا۔ ہائے وائے کا نقشہ بھی پُرزور عبارت میں اُتارا ہے۔ کہیں اِن کی بھوک اور پیاس کا ذکر ہے کہیں اِن کی خواہشات نفسانیہ اور پاک جذبوں کا بیان ہے۔ کہیں اِن کی خراب عیاشی اور رندی کا تذکرہ ہے کہیں کہیں اِن کے عشق و محبت کے جالوں کی گرہیں کھولی ہیں۔ کہیں۔ یہ بیان ہے کہ غیر فانی والدین کے ہاں فانی بچے پیدا ہوتے ہیں +

اگر اِن تمام شعراء کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو خیالات کی بالکل نئی دنیا معلوم ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اِن کی اکثر تصانیف یونانی اور عبرانی لاطینی زبانوں میں ملتے ہیں۔ جن کو ہمارے انگریزی خوان جنٹلمین نہیں دیکھ سکتے۔ اور کٹ ملانوں کے تو وہاں تک جاتے ہوئے پر جلتے ہیں۔ رہے موجودہ ٹوٹے پھوٹے شاعر۔ یہ لاشئے محض ہیں۔ اِن کو صرف کبتگ بندہ کہنا زیبا ہے نہ کہ شاعری کی طرف اِن کی نسبت کرنی +

اِن شعراء متقدمین کا کامل کلام بجلائے خود مذہبی کتابیں ہیں کہ جن پر ہزاروں آدمیوں کا دار مدار تھا اور اِن کے کل عقائد اور دنیوی معاشرت یا روحانی بہبودگی کے اصول کا سرچشمہ شعرا کی تصنیف کی ہوئی نظمیں ہوتی تھیں +

اسٹیگرایٹ (الکھتا ہے کہ اعلےٰ درجہ کی نظم وہ ہے کہ جس میں نامآوروں اور حکما کے اِن کارناموں کا بیان ہو کہ جو اپنے شان میں لاثانی ہوں اور اِن سے بنی نوع پر ایک زبردست اثر پڑے۔ دوسرے قسم کی نظم لوئے درجہ کی

وہ ہے کہ جس میں چھوٹی چھوٹی باتیں اور دنیا کے معمولی واقعات بیان ہوں اور جو
باتیں یا واقعات زیادہ توجہ کے قابل نہیں ہیں اُن پر بحث کی جائے اور اِن کو جامۂ نظم
پہنا کر عام آدمیوں کے سامنے لایا جائے اب ایسے نظم پر خیال کیا جائے کہ جو اِن دونوں
سے بالکل علیحدہ ہے۔ اِن کو شاعر کی ناپاک دماغی جذبات کا ابال کہ سکتے ہیں۔ مثلاً
کسی فرضی معشوق کے خال و خط اور زلف ناگن کا رونا اور اسی کو جپے جانا ایسی نظم نہ
دنیاوی فائدہ کی ہے نہ دینی۔ ہاں اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو روحانی مضرت وہ نقصان
حاصل ہوتا ہے جو روحانی زندگی کے لئے ایسا ہی خوفناک ہے جیسے سنکھیا کا پیالہ
جسمانی زندگی کے لئے اردو شاعری اسی پر مبنی ہے گو اس عیب سے ایرانی شاعری بھی
مبرا نہیں ہو سکتی تاہم اس میں اب بھی بڑے بڑے حکیمہ مطالب موجود ہیں۔ اور جب ہم اِن
کے نیچرل مضامین کو مغربی شعراء کی تصنیف سے ملاتے ہیں تو موخر الذکر شعراء کے خیالات اور
اشعار کی لطافت پاکیزگی اپنے مغربی دوستوں سے بہت بڑھ جاتی ہے ؛
چنانچہ ہم نظیر المشرقی اور مغربی بعض شعرا کا باہم قریب قریب یکساں مضامین میں مقابلہ کرتے
ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ پر مغز مضامین لطافت کے ساتھ کس کے ہوتے ہیں ؛

شیکسپیر

"آؤ اب ہم قبروں - کیڑوں اور بوسیدہ ہڈیوں کی بابت ذکر کریں"
"اپنے نوشتہ پرخون کی آنسو بہائیں"
"زمین کے جگر پر اپنے غموں کے نقوش کر دیں"
"وصیونکو منتخب کریں اور ان سے اپنی مرضی کا ذکر کریں"
"یہ بھی کچھ نہیں۔ بھلا کس کے لئے ہم وصیت کر جائیں"
"اب ہمارے خارج شدہ اجسام کو بحفاظت تمام زمین کے سپرد کر دو"
"ہمارے باغات ہماری زمین ہماری جائداد اور تمام ہمارا مال و متاع"
"ان میں سے ہم کسی کی نسبت اپنے ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ کوئی چیز ایسی"
"نہیں ہے کہ جو ہماری بن سکے۔ سوائے ایک قبر کے جو بیشک ہماری ہے"

"اور وہ بنجر زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے"

"جس میں ہمارا گوشت پوست آمیز ہوگا اور یہ قطعہ ہمارے جسم کو بالکل ڈھانپ لیگا"

"خدا کے لئے آؤ ہم زمیں پر بیٹھیں"

"اور شاہوں کی غمناک موتوں کی کہانیاں کہیں"

"شاہوں پر کیا کیا گزری جس کے بیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے اکثر جنگلوں میں قتل ہوئے"

"بعض ان کے دوست نما دشمنوں نے جن کو مار آستین کی طرح پرورش کیا قتل کر ڈالا۔ بعض شاہوں کو ان کی بیویوں نے زہر ہلاہل دیدیا اور بعض اپنی خوابگاہ میں ایسی حالت میں مارے گئے کہ جب وہ بیہوش پڑے سوتے تھے۔

"سب نے اسی مخوف تاج پر اپنی جانیں قربان کر دیں"

"ان شاہوں کے یہ فانی مقابر سامنے افسردہ رنگت میں دکھائی دیتے ہیں"

"اب انکے دربار میں درباری موت ہے اور خیالی صورت تخت پر جلوہ فزا ہوتی ہے"

"انکی حالت قابل تحقیر ہے اور ان کی جاہ و حشم کا طمطراق زیر لب خندہ کر رہا ہے"

"اس کی مخوف بادشاہت آن کی آن کے لئے چشم حسرت سے اُن کی طرف دیکھتی ہے لیکن موت کا خوف پھر اُس کو نظر میں واپس کر دیتا ہے"

اس میں شک نہیں کہ یہ خاتمی اور دنیا کی بے ثباتی کا مضمون اگر شکسپیئر کی اصلی انگریزی زبان میں پڑھا جاوے تو اس ترجمہ سے ہزار حصہ زیادہ لطف آوے۔ پھر بھی الفاظ کا مفہوم کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی اس ترجمہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے جو اوپر درج ہوا اب اس کے مقابلہ میں ہم اُس عالی دماغ شاعر کے وہ اشعار جو اسی کے ہم مضمون ہیں کہ جس کے سوانح عمری کا یہ مقدمہ ہے درج کرتے ہیں۔ جس سے خیالات کی ہم آہنگی اور روانی کلام معلوم ہو جائیگی ؎

فردوسی

الا اے خریدار مغز سخن   دلت برگسل زیں سرائے کہن

که او چوں من و چو تو بسیار دید | نخواهد همے باکسے آرمید
اگر شهریاری و گر پیشکار | تو اندر گذاری و او پایدار
چو با رنج باشی چو با تاج و تخت | بیایدت بستن بفرجام رخت
اگر ز آهنی چرخ بگزاردت | چو گشتی کهن باز ننوازدت
چو سرو دلارائے گردد بخم | خروشاں شود نرگساں و دژم
همان چهرهٔ ارغوان زعفران | سبک مردم شاد گردد گران
بخسپد روان چونکه بالا بخفت | تو تنها همان زانکه همراه رفت
اگر شهریارے اگر زیردست | جز از خاک تیره نیابی نشست
کجا آں بزرگان با تاج و تخت | کجا آں سواراں بیدار بخت
کجا آں خردمند و کند آوراں | کجا آں سرافراز جنگی سراں
همه خاک دارند بالین و خشت | خنک آنکه جز تخم نیکی نکشت

فردوسی کے اِن اشعار سے کسی قدر مطابقت پائی جاتی ہے مگر آگے آنے والے اشعار بہت ہی کچھ مناسبت شیکسپئر سے رکھتے ہیں*

چو من بگذرم زیں جہانِ فراخ | برآورده بائد مرا خوب کاخ
بجائے کزو دور باشد گذر | نه پرّد برو کرگس تیز پر
سر آورده بر چرخ گرداں بلند | ببالا فزوں بائد از ده کمند
نشسته بر آں بارگاه مرا | بزرگان و جنگی سپاه مرا
فراواں زهر گونه افگندنی | هم از رنگ و بوئے پراگندنی
بکافور تن را تو نگر کنید | ز مشک از بر تارک افسر کنید
ز دیبائے چینی و زربفت و گنج | بیارید تا کار دیده ز رنج
بپوشید بر ما برسم کیاں | ندیدند هرگز بدی را میاں
بسازید زیں هم نشاں تخت عاج | بیاویخته از بر عاج و تاج
همان هر چه زرّیں به پیش اندرست | اگر طاس و جامت اگر مجمراست

گلاب و مے وزعفراں جام نیست | زمشک و کافور و عنبر دلیست
نہادہ بدست چپ و دست راست | زفرماں فرزونی نباید نگاشت
زخوں کردباید تہی گاہ خشک | بدو اندر آگند کافور و مشک
ازاں پس برارید درگاہ را | نباید کہ بیند کسے شاہ را
دگر گوں بود کار آں بارگاہ | نیاید کسے نیز و ما نیز راہ
زفرزند وازدودۂ ارجمند | کسے کش زمرگ من آید گزند
بیا ساید از بزم و شادی دو ماہ | کہ ایں باشد آئیں پس از مرگ شاہ

اندونو لاثانی شعرا کے مفہوم ملانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی کلام میں درد اور اثر کس درجہ کا ہے اور کیسا پرزور کلام ہے کہ جو جبراً مخاطب کا دل اپنے اوپر مائل کرلیتا ہے اس میں شک نہیں کہ جب ہم شیکسپیئر کی ناٹکی نظم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں ایسے ایسے زبردست اور مشکل نکات شاعری کے ملتے ہیں جن کو ہندی انگریزی خوانوں کی عقل نہیں سمجھتے حتےٰ کہ یورپین پروفیسر بھی رہجاتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا میں اپنے رنگ میں اپنا ثانی آپ ہی تھا۔ اسی طرح فردوسی کی نظم ہے جس کی خوبیاں چند ہی عقول سمجھ سکتے ہیں گو پڑھتے ہزاروں ہیں۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں نے فردوسی اور شیکسپیئر کی نادانی سے مشابہت کی ہے۔ فردوسی۔ رزمی نظم کا استاد تھا پھر دونوں کا مقابلہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ ہاں ہومر سے فردوسی کا مقابلہ ہونا تو ٹھیک تھا لیکن ہمارا یہ خیال نہ تھا بلکہ ایک خاص مضمون میں دونوں کی طباعی کا مقابلہ کرکے دکھانا ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ دونو کی نظموں کا رنگ ایک ہی ہے اور یہ دونوں راہ پر قدم زن ہوئے ہیں +

ہمارے خاقانی ہند مرزا غالب نے بھی شیکسپیئر کے مفہوم کو نہایت پر اثر نظم میں ادا کیا ہے جو ہدیہ ناظرین اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ مشرقی اور مغربی نظم کا اس کے خیالات اور ان کی لطافت پاکیزگی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں +

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو | اے چشم از تراوش دل اشکبار شو

اے خون بدیدہ درد و گداز جگر فرست — اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو

اے لب بنوحہ نالہ جانکاہ ساز دہ — اے سر بغصہ خاک سر رہگزار شو

اے خاک چرخ گرزتواں زرجا در آئے — اے چرخ خاک گرنتواں شد غبار شو

اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط — اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو

اے ماہتاب روئے بسیلے کبود کن — اے آفتاب داغ دل روزگار شو

اے فتنہ باد صبح وزید ایں قدر مخسپ — اے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ اینچہ سیل بود کہ مارا ز سر گزشت

تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گزشت

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ — ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ

از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما — اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ

زاں پس کہ با تو آب و ہوائے جہاں نساخت — در روضۂ جناں بتماشا چگونۂ

با گلرخان دہر وفائی نداشتی — با حوریان آئینہ سیما چگونۂ

ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگو کہ تو تنہا چگونۂ

بے مطرب و ندیم و غلاماں خورد سال — بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونۂ

بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت — اینجا عزیز بودی و آنجا چگونۂ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے

پروانہ چراغ مزار تو عالمے

یہ ایک مسلم امر ہے کہ جب تک شاعری کا پورا پورا مذاق نہ ہو۔ اور اس زبان میں کامل درک نہو کبھی لطف شاعری آنہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر ناخواندہ شخص اس سے دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس میں کامیاب ہو جائے۔ موجودہ ترقی کناں زمانہ میں جبکہ مغربی تعلیم کے سیلاب نے تمام ہندوستان کو ہڑپ کر لیا ہے چند ناخواندہ اور علوم مشرقی سے محض نابلد جنہوں نے کسی قدر انگریزی پڑھی یا انگریزی خوانوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں انہوں نے جوں ہی علوم مغربی کے روشن آفتاب کو دیکھا ان کی نگاہیں ایسی چکا چوند ہوئیں کہ پھر انہیں کچھ نہ

سوجھا اور کمبخت بیچاری مشرقی شاعری اور علوم پر اندھا دھند گر پڑے اور خدا واسطے متقدمین کو لعن طعن شروع کردی۔ اردو کو اڑا کر اس وقت عربی اور سنسکرت اور فارسی کی شاعری سے بحث ہے۔ سوال یہ ہے آیا ان واجب التعظیم زبانوں کی شاعری انگریزی شاعری سے کتنی پیچھے ہے اور باہم کیا مناسبت ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا بہت مشکل امر ہے جبتک کہ نمونہ کل زبانوں کے پیش نہ کیئے جاویں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کونسی زبان کی شاعری چربہ ہے۔ چونکہ میں اس کی بابت ایک مستقل رسالہ شاعری میں لکھ چکا ہوں اس لئے اس مطلب کے حل کرنیکے لئے زیادہ وقت نہ لونگا۔ صرف الفنسٹن[۱] صاحب کا ریمارک جو انہوں نے مشرقی اور مغربی شاعری پر کیا ہے نقل کردیتا ہوں۔ اس سے کھل جائیگا کہ قابل نفریں کسی زبان کی شاعری نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں *

"جو شخص زبان سنسکرت سے واقف نہیں ہے وہ کسی طرح سے اس کی نظم پر رائے نہیں دے سکتا۔ سنسکرت کی نظم میں موزونیت پر کمال توجہ کی گئی ہے مگر وہ اس کے ترجمہ میں باقی نہیں رہ سکتے ہے سنسکرت میں ارکان کے بنانے میں جو آسانی ہے اس سے زبان کی فصاحت و بلاغت بہت کچھ زیادہ ہوجاتی ہے لیکن دوسری زبان میں جو اس سے بتائن کلی ہوتا ہے رکنوں میں ثقالت اور بد اسلوبی ہوجانا لابدی امر ہے *

ہندوؤں کی نظم کے مضمون بھی یورپ کے خیالات سے ایسے غیر ہیں کہ ان سے ہم کو پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہماری نظم کے واقعات (یعنے استعارہ و تشبیہ وغیرہ) سے اس کے سمجھنے میں کچھ مدد نہیں ملتی ہندوؤں کے خیالات اور فکر کی خصوصیت سے ہم کو ان کی نظم کی مراد سمجھنی دشوار ہے اور تمام قدرتی مظہر دل اور اشیاء کے مختلف ہونے سے ہمارے اور ان کے استعاروں اور تشبیہوں میں اختلاف ہے اس سے ہمارے پاس ان کی نازک خیالیوں کی رنگینی آدھی رہجاتی ہے اور اہل مشرق کیلئے جس بات سے کلام کو زیب و زینت ہوتی ہے ہمارے حق میں وہ تاریکی اور الجھاؤ کا باعث ٹھہرتی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جاوے کہ ایک معشوقہ کے

[۱] تاریخ الفنسٹن مطبوعہ لنڈن ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۶۴ و ۱۶۳۔

لب بند ہو جیسے پھول ہیں۔ اور اس کے رخساروں پر مدھو کا کی چمک دمک ہے یا اس کے
رخسار چنپہ کے پتے کے مانند ہیں۔ تو ہمارے دل میں کیا خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ
تشبیہیں اُن لوگوں کے سطے جوان کا مذاق رکھتے ہیں ایسی عمدہ اور پر کیفیت
ہیں جیسے کہ ہماری تشبیہیں ہیں کہ ایک جوان حسین معشوق گلاب کا کھلا ہوا پھول ہے
اور عاشق مغموم مثل پرم روز کے ہے۔ باوجود ان تمام وقتوں کے سنسکرت کی
کئی نظمیں جن سے ہم واقف ہیں۔ بہت خوبی اور رنگینی رکھتی ہیں "
ناظر فاضل مؤرخ کے اس صحیح رائے سے جو اس نے مغربی اور مشرقی نظم پر دی ہے بخوبی اندازہ
کر سکتا ہے کہ خیالات کا اختلاف ہرگز ایک دوسرے کی فضیلت اور غیر فضیلت کا باعث نہیں
ہو سکتا۔ بعض نافہم اور موجودہ زمانہ کے کم عقل شعرا نے اپنے جلے پھپھولے پھوڑنے کے
لئے وہ وہ کچھ ہرزہ درائی مشرقی شعرا کی نسبت کی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ہمیں ان کی
یہ تحریریں دیکھ کر شرم آتی ہے کہ جن لوگوں کے خوش کرنے کے لئے وہ ایسی بے معنی تحریریں لکھتے ہیں
اُلٹا ان ہی کا دل دکھتا ہے اور وہ ہی سخت حقارت کی نظر سے ایسے شخص کو دیکھتے ہیں کہ جس کی
یہ بیہودہ رائے ہو۔ کہیں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مختلف خیالات سے زبان کی دلچسپی اور خوبصورتی
کم ہو جاتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا نقصان عاید ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں؟
مثلاً انگریز اپنے دلبر کی خوبی ان تشبیہوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا قد لمبا اور خوبصورت
تھا اس کے بال سنہری اور گھونگر والے تھے۔ اس کی آنکھیں آسمان کی گہری نلاہٹ سے
بھی زیادہ لطیف نیلی تھیں۔ اس کے رخسارے گلاب کے پھول کی طرح سُرخ و سفید تھے۔ اور
مشرقی شعرا اپنے معشوق کی یہ تعریف کرتے ہیں۔ سرو قد۔ آہو چشم۔ سیاہ بال۔ شکر لب
یا مثلاً یوں تعریف کرتے ہیں ؂

بجسم زلف او پنہاں یکے خورشید نور افشاں — چو در زندان شہ کنعاں مہ تاباں چو در ظلما
پری رو ہی پری خو ہی پری صورت پری سیرت — پری زاد و پری پرواد پری زادہ ہم پری دا
پری نژاد و پری طبع و پری پیکر پری شہپر — پری چہرہ پری چہرو پری زلف و پری پیرا
رخش رنگیں خطش مشکیں گل چیں جبیں پرچیں لبش شیریں — زہے پیشانی و لب بستی و شیرینی بہم یک جا

لے۔ پرم روز پھول کا رنگ زرد سُرخ سفید زردی مائل ہوتا ہے ؂

نگارے ناہوش نازک بُتے شوخے ستمگارے
بُتے سنگیں دل وشنگوں و شوخ شنگ بے پروا

یا ہم مشرقی معشوق کی یوں تعریف کریں +

دو ابرو کماں و دو گیسو کمند
ببالا بکردار سرو بلند

دو برگ گلش سوسن می سرشت
دو شمشاد عنبر فروش از بہشت

بنا گوش تابندہ خورشید دار
فرو ہشتہ زو حلقۂ گوشوار

لباں از طبرزد زباں از شکر
دہانش مکلل بدرّ و گہر

ستارہ نہاں کردہ زیر عقیق
تو گفتی دہانٗ زہرہ آمد رفیق

روانش خرد بود و تن جان پاک
تو گفتی کہ بہرہ ندارد ز خاک

جو شخص اِن زبانوں کو بخوبی جانتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ مشرقی خیالات کی موزونیت کے لئے مشرقی زبانیں موزوں ہیں اور مغربی زبانوں کو مغربی خیالات سے زیب و زینت ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں شاہنامہ سکندر نامہ اور دیوان حافظ یا کلیات سعدی کا ترجمہ ہو گیا ہے کیا کوئی کہ سکتا ہے کہ ان کی وہ اصلیت بجا رہی یا اصلی خوبی باقی رہی۔ ہاں اس قدر ضرور ہوا کہ خیالات معلوم ہو گئے اور کچھ لطف نہیں آیا۔ اسی طرح جن انگریزی شعرا کی نظموں کا اردو یا فارسی نظموں میں ترجمہ ہو گیا ہے تو کون کہ سکتا ہے کہ اصلی زبان کی خوبی کا ایک سواں حصہ بھی قائم رہا ہوگا۔ اس پہلو سے کوئی زبان قابل نفریں ہو سکتی ہے نہ اُس کی شاعری۔ ہاں فضائل کے جانچ کرنے کے دوسرے پہلو ہیں اور وہ کشادگی خیالات اور وسعت ذہن ہے +

مثلاً اگر ہم اس پہلو سے اردو فارسی شاعری کی انگریزی شاعری کے آگے مذمت کریں کہ اُردو فارسی کے شاعروں نے اپنی قوت متخیلہ کی وسعت۔ طبیعت کی جودت۔ ذہن کی تیزی۔ اور قوت متفکرہ کی بلند پروازی کو زیادہ تر نہ بالکل فرضی دلبر کی سیاہ زلفوں میں اٹکا دیا ہے اور آگے نہیں بڑھے ہیں۔ یا امرا اور رئیسوں کی بیجا تعریفوں میں اپنے کو لت پت کر دیا ہے۔ اور اُس سے آگے نہیں نکلے ہیں تو یہ مذمت کسی قدر صحیح ہے۔ تاہم پھر دیکھنا پڑیگا آیا اردو فارسی کے کل شعرا ایسے ہی تھے جو ایسی نظم لکھنا پسند کرتے تھے۔

یا بعض ایسے بھی ہوئے ہیں جو تماشاگاہ نیچر کے اسٹیج پر ایکٹ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس پوشیدہ بات کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے بہت بڑی واقفیت درکار ہے ایسے دقیق مسئلہ پر اٹکل پچو رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

اگر ہم ان بی تعداد شعرا کا تذکرہ کریں جو ایران میں گزر گئے ہیں تو تحریر کو انتہا درجہ طول ہو جائیگا اور لطف سخن جاتا رہے گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ چند مختصر جملوں میں اس کی بابت بیان کر دیا جائے صرف بحث ان شعرا سے ہے کہ جو بہت مشہور ہیں اوّل ہم سعدی کو پیش کرتے ہیں کہ جو واقعات کے نظم میں موزون کرنے میں اُستاد کامل تھا۔ اس کی شاعری عجیب و غریب و دلکش سین اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس کی شاعری میں تمدنی اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک ایک شعر لطافت اور حکمت و معنی کا مخزن ہے۔ وہ حکمیہ مسائل جو لاینحل تھے۔ اس فاضل شاعر نے انہیں نظم میں بآسانی حل کر دیا۔ وہ جیسا واقعات بیان کرنے میں کمال رکھتا ہے اسی طرح انسانی جذبات کو ہر پہلو اور ہر رنگ سے ظاہر کرنے میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ تمام افعال انسانی کا اس عمدہ طور سے مختلف پیرایہ میں فوٹو اتارتا ہے کہ سخت حیرت و استعجاب معلوم ہوتا ہے کبھی یاس و حرماں نصیب کا افسردہ نقشہ کھینچتا ہے۔ اور کبھی شادی و فیروزمندی کا ہو بہو خاکہ اُتارتا ہے۔ کبھی دو ایک شعروں میں علم سیاست مدن بیان کر جاتا ہے۔ کہیں معمولی اشعار میں سوشیل اور مارل کے مہذب قواعد کو بند کر دیتا ہے۔ اس نے امرا اور شاہوں کی تعریف بھی کی تو اور پیرایہ پر تا اُن کو تنبیہ کرکے بری باتوں سے بچائے اور عدل و انصاف کی طرف اُن کو متوجہ کرے۔ کیا کوئی معمولی گلستاں بوستاں پڑھنے والا شخص سعدی کے کلام کی خوبی سمجھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے لئے علم معانی اور فصاحت و بلاغت کا بہت بڑا علم چاہئے۔ جب کہیں اس کے کلام کی خوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ سعدی کے بعد ہم انوری اور خاقانی کو پیش کرتے ہیں یہ دونو شاعر بھی بڑے پایہ کے ہوئے ہیں۔ خاقانی نے اصول تصوف کو اپنے اشعار میں زینت دی ہے اور اپنی پرزور نظم سے اس کے پیچیدہ اور قریب قریب لاینحل مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اکثر جگہ وہ کامیاب بھی ہو گیا ہے

مگر انوری کا کلام ادق اور حکیمانہ اور اس کا زیادہ تر منطقی پیرائہ ہے۔ اس لیئے کہ وہ خود بہت بڑا حکیم تھا۔ اِن شعرا کے رنگ بہت کچھ ملتے ہیں اور زیادہ تر قصائد میں زیادہ نام آور ہوتے ہیں۔ لیکن غزلیات میں بڑے نامور حافظ۔ سعدی۔ خاجو اور شمس تبریز ہیں۔ جن کی نظیر اس رنگ میں دنیا بھر میں نہ ملے گی۔ حافظ خود لکھتے ہیں۔ شعر

استاد غزل سعدی پیش ہمہ کس اما دارد سخن حافظ طرز سخن خاجو

غرض یہ ہے کہ نظم نے جو درحقیقت ایک رحمت اور لقائے زبانی ہے اپنے عاشقوں کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بجا دیا ہے۔ ہر شخص اِن کے اشعار پڑھتا ہے اور رقص کرتا ہے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ القائے ربانی کا نزول یکساں ہر ایک کے دماغ میں ہوتا ہے۔ کسی قسم کا ہرگز تفاوت نہیں ہوتا۔ صرف ضمیر کے سانچہ میں ڈھلکر جس صورت میں اس کا ظہور ہوتا ہے اکثر شکل اصل سے سخت تبائن کلی پڑجاتا ہے اور کہیں اپنی اصلی ہیئت سے القائے ربانی منصہ ظہور پر جلوہ پذیر ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ سکتے ہیں کہ جس کا ضمیر پاک اور برتر نتھرے ہوئے خیالات سے پُر ہوتا ہے القائے ربانی اسی کے خیالات کا جامہ پہنکر جلوہ کرتا ہے اور اور جس کا ضمیر نفسانی بیہودہ جذبوں سے طبرا ہوا ہے وہ جب شاعری کرے گا۔ ویسے ہی مضرت وہ اشعار اس کی زبان سے نکلینگے اور لوگوں کو سوائے نقصان کے فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ اکثر ایسے ہیں کہ جن پر القاء ربانی کا سایہ پڑتا ہے لیکن ضمیر کے تاریکی سے وہ بھی سیاہ ہوجاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ نظم الہام ہے جو صحیح الضمائر کو ہوتا ہے اور نئے نئے اور اعجوبہ رنگوں میں جلوہ کرتا ہے۔

فردوسی کا نام نسب ولادت بچپن تعلیم

منصور نام۔ حکیم لقب ابو القاسم کنیت فردوسی تخلص۔ فردوسی شاداب میں ۳۲۸ھ میں پیدا ہوا۔ شاداب مواضع طوس کا ایک موضع تھا۔ فردوسی کا باپ بہت بڑا فاضل اور مذہبی پیشوا تھا اور اس کو مولانا فخر الدین احمد مولانا فخر الفردوسی کہتے

تھے۔ اور اسے اپنے ہمچشموں میں خاصی وقعت حاصل تھی سر جارج ہملٹن کی تحریر کے بموجب یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف اس کی وجہ معاش خوش اعتقادوں پر منحصر تھی۔ اس کے علم و فضل پر ہم کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتے صرف اس قدر تواریخی حالات سے کھلتا ہے کہ وہ مذہبی گروہ کا بڑا رکن تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ بعض وجوہ سے اس نے اپنے کو شیعہ بنا لیا تھا ورنہ در حقیقت وہ بڑا سُنی المذہب تھا۔ اس نے یہ اپنے کو سید کہتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ میں حضرت زین العابدین کی اولاد میں ہوں۔ اس کی تصدیق کے لئے ہمارے پاس شہادتیں موجود نہیں ہیں۔ صرف ہم سر جارج ہملٹن کی تحریر پر تکیہ کر کے اس کو صحیح مان لیتے ہیں۔ فردوسی کے پیدا ہونے پر اس کے باپ فخر الدین نے ایک خواب دیکھا جو درج کیا جاتا ہے "فخر الدین نے خواب میں دیکھا کہ منصور ایک بلند کوٹھے پر چڑھ گیا اور قبلہ رو ہو کر ایک نعرہ مارا اور سجدہ کیا۔ چاروں طرف سے مرحبا و صد مرحبا کی آوازیں بلند ہونے لگیں" یہ خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ شیخ نجیب الدین معبّر کے پاس گیا۔ یہ شخص تعبیر کہنے میں بہت مشہور تھا اور اکثر دور دور سے لوگ دریافت کرنے کے لئے اس کے پاس چلے آتے تھے۔ فخر الدین نے جب شیخ سے اپنی خواب کی کیفیت بیان کی تو اس نے یہ تعبیر دی "وہ آواز جو قبلہ رو سجدہ پر تیرے بیٹے منصور نے لگائی تھی وہ آواز آوازہ سخن ہے جو بڑی عمر میں اسے حاصل ہوگا اور ان آوازوں سے جو اس کی آواز لگانے سے چاروں طرف سے بلند ہوئیں مطلب صرف یہ ہے کہ چاروں طرف اسی کے سخن کا ڈنکا بج جائیگا اور ہر شخص اس کو تسلیم کریگا۔ یہ خوش آیندہ پیشین گوئی جو تعبیر کے لباس میں جلوہ پذیر ہوئی تھی عجیب و غریب افسون اپنے میں رکھتی تھی خصوصاً ایک باپ کے لئے تو یہ روحانی شادمانی تھی جو سُنتے ہی خوش ہو گیا اور اسے اس قدر شادمانی ہوئی کہ اپنے اسی وجد انگیز شادی میں ایک ٹکا اور ایک قبا اور کچھ زر نقد شیخ نجیب الدین کو دیکر یہ کہا "خدا کرے آپ کی یہ تعبیر صحیح نکلے اور میرا بچہ ایسی ہی بد بہت شہرت علمی دنیا میں حاصل کرے" فخر الدین کی علمی اعلیٰ ظرف کا اندازہ یہاں سے بخوبی

ہوسکتا ہے۔ کہ اس نے اپنے بیٹے کے عالم ہونے پر اتنی خوشی ظاہر کی۔ یہ نہ چاہا کہ وہ دولتمند ہو اور علمیت پر اس کی دولتمندی غالب ہو ٭

سر جارج ہملٹن ہی نے تحریر کیا ہے کہ فردوسی کی ماں نے جو بہت دیر سے منتظر بیٹھی ہوئی تھی فخرالدین اپنے خاوند سے دریافت کیا کہ تعبیر کیا بتائی۔ اس نے جو کچھ شیخ معبر نے بتائی تھی بیان کردی ماں نے گھبرا کر دریافت کیا کہ دولتمندی کی بابت بھی کچھ بیان کیا فخرالدین نے ترش ہو کر جواب دیا الحمد اللہ کہ میرا بیٹا دولتمند نہیں بلکہ عالم بنیگا۔ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شاداب میں بخوبی جاری تھا۔ اکثر شرفائے وہ فخرالدین کے پاس مذہبی علوم پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ فردوسی کا بچپن نہایت خوبصورت اور لطیف تھا۔ یہ جب تین ساڑھے تین برس کا تھا اپنے باپ کے پاس طلبہ کا سبق سننے کے لئے بیٹھ جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے بغیر روئے خاموش بیٹھا ہوا سنتا اور ہوں ہوں کیا کرتا۔ جب زیادہ دیر ہوتی تو وہیں اونگھنے لگتا اور باپ اپنی گودی میں سلا رکھتا۔ گو فردوسی کی عمر ابھی اتنی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ صاف باتیں کرسکتا کیونکہ بموجب تحقیق سر جارج ہملٹن کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کی زبان ساڑھے پانچ برس میں بخوبی کھل گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ لیکن بہت ہی ٹوٹی پھوٹی۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں کو کبھی نہیں ستایا رونا جانتا ہی نہ تھا کسی چیز پر ضد نہیں کی اور نہ کسی کی دی ہوئی چیز بغیر کئی انکار وں کے لی۔ عموماً جتنی باتیں کہ عام بچوں کو خوش کرتی ہیں فردوسی کے لئے وہ ہی باعث نفرت تھیں۔ وہ خود نہ سمجھتا تھا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے لیکن یہ نظارہ اس کے دل بہلنے کے لئے کافی تھا۔ دوسرا شوق جو فردوسی کو چار پانچ برس کی عمر سے ہوگیا تھا پانی کے پاس بیٹھنا تھا۔ خصوصاً آب رواں اس کی رواں کے لئے دگنی شادمانی کا باعث ہوتا تھا وہ اکثر چلتے چلتے پانی کے چشموں۔ تالابوں کو انگلی سے بتانے لگتا۔ دیکھو وہ پانی دکھائی دیتا ہے اور وہ نہر نہ رہی ہے ٭

فخرالدین کی آنکھیں لمبے ہونہار بچہ کی طرف اٹھ رہی تھیں وہ اس کی طرز و انداز کو بغور ملاحظہ کرتا اور اس کی دلچسپی کو دیکھتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ طبیعت ضرور اپنے

میں ممتازیت کا مادہ رکھتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آب رواں سے دلچسپی اس کی طبع کی روانی کی کافی دلیل ہے۔ فخر الدین کے پاس کافی سرمایہ تھا کہ وہ اپنے بچہ کو باقاعدہ تعلیم دے اور اسے اپنی زندگی میں فاضل بنا دے۔ شاداب میں باقاعدہ کوئی سکول نہ تھا کہ جہاں آئندہ زبردست شاعر تعلیم پاتا اور اپنے طبعی جوہروں کی جلا کرتا اور انہیں چمکاتا اس لئے مہربان باپ نے یہی مناسب جانا کہ پہلے اسے خود ہی تعلیم دے اور شفقت سے پڑھائے لیکن فخر الدین کے اس خیال نے درجہ تکمیل حاصل نہ کیا اور اسے مجبوراً ایک دوسرا اُستاد فردوسی کے لئے مقرر کرنا پڑا۔ فردوسی نے جس شخص کے آگے کر پہلے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے اس کا نام علامہ قطب الدین تھا جو دمشق کا رہنے والا تھا اور اب چند سال سے شاداب میں اپنی زندگی کے دن زمانہ سے بیداغ ہو کر پورے کر رہا تھا۔ یہ دراصل شیعہ تھا لیکن اپنے کو سُنی ظاہر کرتا تھا اور صرف مذہبی وجہ سے یہ اپنے کنبہ سے لڑ جھگڑ کر طوس چلا آیا تھا اور مواضع طوس میں اسے شاداب فرحت بخش معلوم ہوا۔ قطب الدین پوری تحصیل کا شخص تھا اور دراصل وہ بڑی بڑی کتابیں پڑھاتا تھا۔ لیکن فخر الدین کے ساتھ ایک خاص تعلق ہونے کی وجہ سے اس نے فردوسی کو ابتدائی تعلیم دینا منظور کر لیا۔ اور اس کو پڑھانا شروع کیا۔ گو وہ ذہین معمولی بچوں کا سا تھا لیکن اس کا حافظہ بہت بڑا تھا اور وہ جو کچھ پڑھتا اسے حفظ یاد کر لیتا تھا معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد اسے قران شریف پڑھا اور ڈیڑھ برس میں اسے ختم کر لیا۔ بعد ازاں اس نے قران شریف کو حفظ کرنا چاہا کیونکہ نظم قرانی اسے بہت بھا گئی۔ وہ اس کی فصاحت و بلاغت پر دل سے مٹا ہوا تھا لیکن یہ امید اس کی بر نہ آئی اور وہ بہت جلد ناکام ہو کر بیٹھ رہا اور اس سے خواہ مخواہ اسے دست بردار ہونا پڑا۔ گو عظیم سمرقندی نے یہ تحریر کیا ہے کہ اس نے نصف قران حفظ یاد کر لیا۔ لیکن اس نے بھی معقول وجہ اس کی کوئی نہیں لکھی کہ فردوسی نے قرآن مجید سارا کیوں نہیں حفظ کیا۔ ہم تاریخی واقعات پر خیالی رائے قائم نہیں کر سکتے اس لئے اس کی بابت کوئی بحث نہ کریں گے۔ واقعات سے اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ جب اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی وہ خواجہ نصیر الدین کے پاس ریاضی تحصیل کرنے گیا پہلے اس نے

اقلیدس پڑھی اور چھ مہینے میں اس نے بخوبی اقلیدس کو سمجھ لیا اور نئی نئی شکلیں حل کرنے لگا۔ پانچویں چھٹے مقالہ کی شکلوں نے اسی مجبور کیا کہ وہ کچھ حساب بھی سیکھے اور اس میں بھی درک پیدا کرے چنانچہ اس نے حساب میں بھی جلد ملکہ پیدا کر لیا۔ یہ نہیں کھلتا کہ نصیر الدین سے فردوسی نے کس شہر میں جاکر ریاضی تحصیل کی ہاں واقعات سے اس قدر تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاداب میں رہتا تھا لیکن اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ نہ کسی خاص مقام کا پتہ چلتا ہے سر جارج ہملٹن بھی اس ذکر کو صاف اڑا گئے ہیں کہ فردوسی نے دوبارہ کس شہر میں زانوئے شاگردی تہ کیا۔ صرف اتنا لکھا ہے۔ کہ وہ نصیر الدین کے پاس ریاضی پڑھنے گیا۔

ریاضی کی بعد اس نے اپنے باپ کے کہنے سے دوبارہ مذہبی دنیا میں قدم رکھا اور تحصیل علوم دین شروع کے۔ مختلف واقعات سے جو اس کی نسبت بیان ہوئے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت جلدی مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کر لی اور آپ اس نے چند کتابیں مذہب شیعی میں تصنیف بھی کیں۔ ساتھ ہی اس کے جوں جوں عمر بڑھتی گئی فردوسی کو شعر شاعری کا شوق ہوتا گیا اور آخر اس نے اپنی زندگی ہی میں وہ نام پیدا کیا کہ بڑے بڑے سلاطین اس کے قدردان ہو گئے"

ہمیں افسوس ہے کہ کسی نے فردوسی کے پورے پورے حالات کا تذکرہ نہیں کیا نہ اس کے باقاعدہ سوانح عمری لکھے۔ جن لوگوں نے کہیں کہیں شعراء کے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے اُس کی نسبت ایسے ناممکن الوقوع حکائتیں بیان کی ہیں کہ جنہیں عقل سلیم کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان نقلی حکائتوں اور مختلف تذکروں سے ہم اس قدر مطالب نکال سکتے ہیں کہ فردوسی نے شاعری میں مشہور ہونے سے پہلے مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کر لی تھی اور کئی فقہی مسایل کی کتابیں تصنیف کر چکا تھا۔ ہم ان واقعات کا تعاقب نہیں کرتے جو بہت کم مشہور ہیں۔ اور معمولی مصنفوں کی قلم سے نکلی ہیں۔ صرف چند مشہور مشہور باتوں پر بحث کرتے ہیں جو زیادہ دلچسپی کے قابل ہیں۔ جب فردوسی نے اپنا رخ ان نظم کی طرف دیکھا تو اس سے اور کل باتوں کو چھوڑ

دیا اور یہ چاہا کہ کوئی تاریخ نظم میں ایسی لکھوں کہ جو میرے بعد میری یادگار رہے
مگر اس ارادہ کی تکمیل کے لئے کسی شاہ کی سرپرستی ضرور درکار تھی اور پھر سرمایہ کا
ہونا بھی ضروری تھا +

شاہنامے کے تصنیف کی تحریک

ایک دن فردوسی اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے
اپنا خوش وقت گزار رہا تھا۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آیا کہ اگر ایرانی گزشتہ شاہوں کی
تاریخ نظم میں لکھی جائے تو نہایت مقبول ہوگی۔ اے فردوسی اگر تو اس عظیم الشان
کام کی تکمیل اپنے ذمہ لے تو تجھے شایاں ہے۔ تیری تیز طبعی سے مجھے امید ہے کہ تو بہت
کچھ نظم میں نئے واقعات کو تازگی بخشیگا اور کیا عجب ہے کہ اس کی مقبولیت تجھے آسمان
عزت پر پہنچا دیوے +

فردوسی نے جواب دیا اے محمد لشکری یہ خیال کئی مہینے سے میرے دل میں آرہا
ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس سرمایہ تاریخ نہیں ہے کہ میں ان واقعات کو
نظم میں لاؤں۔ اس نے نہایت سرگرمی سے جواب دیا کہ میرے پاس تاریخ ایران موجود
ہے آپ مستقل طور سے اس کام کو شروع کریں۔ فردوسی یہ سن کر بہت خوش ہوا اور
اپنے دوست محمد لشکری سے کتاب لیکے شیخ محمد معشوق طوسی علیہ الرحمۃ کے پاس گیا جو
اس زمانہ میں بہت بڑے صاحب کشف اور بزرگان دین میں سے تھے۔ سرجارج
ہملٹن لکھتا ہے کہ فردوسی اس شیخ کا مرید بھی تھا۔ غرض وہ کتاب شیخ کے پاس نہایت
ادب سے پیش کی اور عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں اور میرا یہ ارادہ ہے آپ مجھے برکت دیں
اور میرے لئے دعا کریں کہ یہ کام انجام پذیر ہو جائے +

بزرگ شیخ نے فردوسی کے لئے دعا کی اور ایک رقعہ والی طوس ابو منصور کو لکھ دیا
جو اُس کے معتقدین میں سے تھا۔ اس رقعہ میں فردوسی کی سفارش لکھی ہوئی تھی پھر
ارشاد ہوا کہ تم حاکم طوس کے پاس یہ رقعہ لیجاؤ اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کرو۔

یقیناً وہ تمہاری مدد کریگا اور ضرور تمہیں اُس کے دربار میں رسوخ حاصل ہوگا۔ فردوسی نے شیخ موصوف کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی وہ سفارشی نوٹ لیکر سیدھا گورنر طوس ابوالمنصور کے پاس پہنچا۔ اور وہ سفارشی نوٹ پیش کیا۔ ابوالمنصور بڑا قدردان علم گورنر تھا۔ وہ فردوسی کو دیکھ کر بہت خوش ہُوا اس نے فردوسی کو اس کے ارادہ پر مبارکباد دی اور حکم کیا کہ تو نمونہ کے طور پر جنگ ضحاک و فریدوں نظم کر کے لا۔ ابوالمنصور نے اپنے باغ میں ایک خاص جگہ فردوسی کو رہنے کے لئے دیدی اور اپنے باورچی خانہ سے پُرتکلف کھانوں کے خوان دونو وقت بھجوادیا کرتا غرض اس نے فردوسی کی اتنی خاطر کی جتنی ایک قدردان سلطان عالم کی کرسکتا ہے +

فردوسی نے حسب الارشاد بہت جلد ضحاک اور فریدوں کی سرگذشت نظم میں موزون کر کے پیش کی۔ ابوالمنصور کو بہت پسند آئی اور اس نے معقول تنخواہ کر کے فردوسی کو آگے لکھنے کے لئے حکم دیا۔ مگر فردوسی نے ابھی اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تھی کہ یکایک درد قولنج سے اس کا انتقال ہوگیا۔ اور فردوسی چند روز کے لئے سخت متردد اور پریشان ہوا۔ فردوسی کو اپنے سرپرست شاہ کے گزرجانے کا انتہا درجہ صدمہ ہوا۔ کیونکہ اس کو یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک حکمران کا پیارا بنے اور دربار میں اس کی اتنی عزت کی جائے +

فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں پہلے محمد لشکری کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں ابوالمنصور کی تعریف کر کے اس کا مرثیہ نہایت دردانگیز لہجہ میں بیان کرتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابوالمنصور اس پر کتنا مہربان تھا اور اس وفات کا فردوسی کو کتنا صدمہ ہوا پہلے اس نے محمد لشکری کی گفتگو کا یوں تذکرہ کیا ہے اور تاریخ ایران وصول ہونے کی بابت شکریہ کے طور پر یہ لکھتا ہے +

دلِ روشنِ من چو برگشت ازو	سوئے تختِ شاہِ جہاں کرد رو
کہ ایں نامہ را دست پیش آورم	ز دفتر بگفتارِ خویش آورم
بپرسیدم از ہر کسے بے شمار	بترسیدم از گردشِ روزگار
مگر خود درنگم نباشد بسے	بباید سپردن بدیگر کسے

دو دیگر کہ گنج وفادار نیست — ہمہ رنج را کس خریدار نیست
زمانہ سرائے پُر از جنگ بود — بجویندگاں بر جہاں تنگ بود
بریں گونہ یک چند بگزاشتم — سخن را نہفتہ ہمیداشتم
بدیدم کسے کش سزاوار بود — بگفتار ایں مر مرا یار بود
زنیکو سخن بہ چہ اندر جہاں — برو آفریں از کہان و مہاں
اگر بہ نبودے سخن از خدائے — نبے کے بُدے نزد ما رہنمائے
بشہرم یکے مہرباں دوست بود — تو گفتی کہ با من بیک پوست بود
مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو — بہ نیکی خرامد مگر پائے تو
نوشتہ من ایں نامۂ پہلوی — بہ پیش تو آمد مگر نغنوی
گشادہ زبان و جوانیت ہست — سخن گفتن پہلوانیت ہست
شو ایں نامہ خسروی بازگوے — بدیں جوئے نزد مہاں آبروے
چو آورد ایں نامہ نزدیک من — برافروخت ایں جان تاریک من

مختصر طور پر فردوسی نے محمد لشکری کا ذکر کر کے تاریخ ایران کا ذکر کیا ہے کہ جب مرے پاس وہ نامہ آیا تو میری تاریک جان روشن ہوئی۔ یعنی میں مغموم تھا خوش ہو گیا۔ اور مارے خوشی کے کھل گیا۔ کتاب حاصل ہونے کے بعد جب ابو المنصور کی درگاہ میں پہنچا ہے تو اس کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ پہلے فاضل شاعر اس کی تعریف کرتا ہے +

بدیں نامہ چوں دست کردم دراز — یکے مہترے بود گردن فراز
جواں بود از گوہر پہلواں — خردمند و بیدار و روشن رواں
خداوند رائے و خداوند شرم — سخن گفتن خوب و آوائے نرم
مرا گفت کز من چہ آید ہمے — کہ جانت سخن برگراید ہمے
بچیزے کہ باشد مرا دسترس — بکوشم نیازت نیارم بکس
ہمیداشتم چوں یکے تازہ سیب — کہ از باد نامد بمن بر نہیب

بکیواں رسیدم زخاک نژند | ازاں نیک دل نامور ارجمند
بچشمش ہماں خاک ہم سیم زر | کریمی بدو یافتہ زیب و فر
سراسر جہاں پیش او خوار بود | جوانمرد بود و وفادار بود

فاضل شاعر نے کس عمدہ پیرائے میں اپنے آقائے نامدار گورنر طوس ابو المنصور کی تعریف کی ہے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ خود ابو المنصور نے فاضل شاعر سے تحریک کی اور کہا حتے الوسع میں تیری مدد دینے میں کوشش کرونگا۔ مگر افسوس زمانہ نے فردوسی کو زیادہ خوش نہ رہنے دیا اور ابو المنصور آخر کار انتقال کر گیا۔ اس کی جانکاہ وفات پر ہمارا فاضل شاعر یوں قلم فرسائی کر کے اپنے دردناک خیالات کا اظہار کرتا ہے +

چناں نامور گم شد از انجمن | چو از باد سرو سہی در چمن
دریغ آں کمر بند و آن گردگاہ | دریغ آں کئی برز بالائی شاہ
نہ زو زندہ بینم نہ مردہ نشاں | بدست نہنگاں مردم کشاں
گرفتار دل زو شدہ نا امید | رواں لرز لرزاں بکردار بید
ستم باد بر جاں آں شاہ و سال | کجا بر تن شاہ شد بد سگال
یکے پند آں شاہ یاد آورم | زکسرے رواں سوئے داد آورم
مرا گفت کایں نامۂ شہریار | اگر گفتہ آید بشاہاں سپار
دل من بگفتار او رام شد | روانم بدیں شاد و پدرام شد

ابو المنصور مرتے وقت یہ وصیت کر گیا تھا کہ جب تک تو شاہ گردن فراز کو اپنا سرپرست نہ بنا دیگا یہ محض ناممکن ہے کہ تو اپنے ارادہ پر کامیاب ہو چنانچہ فردوسی نے یہی کیا اور اسی حیلہ سے محمود کے دربار میں پہنچا +

جب منصور کی وفات کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی تو محمود نے ارسلان خاں کو گورنر طوس بنا کر روانہ کیا۔ جب فردوسی ارسلان خاں ہی کے پاس پہنچا اور اس سے اپنی سرگذشت بیان کی تو وہ بھی بہت خوش ہوا اور اس نے قدر افزائی فرمائی۔

مگر ابو المنصور کی سی قدر شناسی اس میں نہ تھی۔ فردوسی نے یہی غنیمت جانی اور
ایک عرضی چند روز کے بعد ارسلان خاں کی معرفت دربار محمود میں روانہ کی محمود جیسا
کہ عموماً تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے علم و ہنر کا دلدادہ تھا وہ فردوسی کی درخواست
دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے ارسلان خاں کو حکم بھیجا کہ فردوسی کو بہت جلد
روانہ کردو چنانچہ اس نے فردوسی کو غزنی روانہ کردیا +

مگر عظیم سمرقندی نے فردوسی کے غزنی روانہ ہونے کو یوں لکھا ہے۔ کہ
جب ارسلان خاں گورنر طوس ہو کر آیا تو فردوسی کئی دن کے بعد اس کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ اول تو اسے یہ ناگوار معلوم ہوا دوسرے فردوسی کا کوئی قصیدہ اس
کی تعریف میں نہ پیش کرنے نے اور بھی اس کی مشتعل غصہ کی آگ کو بھڑکایا۔ اس
نے فردوسی کو عین دربار میں بہت سخت و سست کہا اور یہ الفاظ زبان پر لایا کہ
شاہوں کے داب سے بالکل واقف نہیں ہے اور تو نہیں جانتا کہ کیونکر خدمت
عالی میں حاضر ہوا کرتے ہیں۔ تجھے اپنے علم کا بہت زعم ہے اور یہ زعم تجھے ایک دن
ذلیل و خوار کریگا۔ تو میرے دربار سے چلا جا اور پھر کبھی مجھے منہ نہ دکھائیو۔ یہ بیجا
باتیں سن کر فردوسی عرق عرق ہوگیا اور اس قدر ذلیل ہؤا کہ جس کا ٹھکانا نہیں۔ اور
خاموشانہ نیچے نگاہیں کئے ہوئے واپس چلا آیا۔ ارسلان خاں نے اس تذلیل پر
ہی قناعت نہ کی بلکہ اس نے تنخواہ بھی بند کردی اور طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔
ناچار فردوسی دق ہوگیا اور ایک شب ارسلان خان کے مظالم سے تنگ آکر طوس
کو چھوڑا اور غزنی کی راہ لی۔ عظیم سمرقندی کی اس تحریر پر ہم کچھ رد و قدح نہیں معلوم
کرتے بلکہ اس کے مقابلہ میں اس قدر لکھ سکتے ہیں کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس
نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ابو المنصور کے مرنے کے بعد جب ارسلان خاں آیا ہے۔
تو محمود کی پہلی ہدایت یہ تھی کہ فردوسی کو ہمارے دربار میں روانہ کردینا۔ اس لئے
ممکن ہے کہ عظیم سمرقندی کی تحقیق غلط ہو۔ غرض فردوسی غزنی کی طرف روانہ
ہؤا +

فردوسی کا دربار محمود میں پہنچنا

طوس سے فردوسی ہرات پہنچا۔ دربار شاہی میں فردوسی کی آمد آمد کی خبریں گرم ہوئیں بدیع الدین میر منشی دربار نے رودکی اور عنصری سے کہا تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ کہ فردوسی آرہا ہے۔ وہ ہکا بکا اس کی طرف دیکھ کر یہ کہنے لگے۔ کہ ہمیں اس کی کچھ اطلاع نہیں بدیع الدین نے کہا کہ حضرت ظل سبحانی سلطان محمود کی طلب پر وہ یہاں آرہا ہے یہ سنتے ہی عنصری اور رودکی کے چار عنصروں میں خلل عظیم برپا ہوگیا اور وہ فردوسی کا نام سن کر بہت گھبرائے تو گو اُنہوں نے اب تک فردوسی کے اشعار نہ دیکھے تھے تاہم اُنہوں نے اس کی شہرت اور تعریف بہت سنی تھی اس لئے وہ دم بخود تھے کہ کیا کریں۔ بدیع الدین نے ان کی پیشانی تاڑ لی اور یہ گویا ہوا۔ حضرت سلطان المعظم کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ میرے ارادہ کی تکمیل میرے درباری شعرا میں سے کوئی بھی نہیں کرسکتا اگر کچھ کرسکیگا تو فردوسی کرسکیگا۔ اور حقیقت میں وہ بڑے پلّہ کا شاعر ہے۔ عنصری اور رودکی نے کہا کہ یہی موقع مدد کرنے کا ہے کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ واپس چلا جائے اور پھر رُخ نہ کرے تاکہ ہماری وقعت میں کچھ فرق نہ آجائے تاہم بڑی دیر تک مشورہ ہو کر یہ امر طے پایا کہ عنصری اور رودکی اپنے طرف سے خط لکھیں اور اسے اس بات میں فریب دیں کہ سلطان محمود کو شاعری سے کچھ شوق نہیں ہے۔ ہم جتنے شعرا کہ دربار میں حاضر رہتے ہیں ہم سے بھی کبھی یہ ارشاد نہیں ہوتا کہ اپنی اپنی تصنیف کے اشعار سنائو۔ ہم محض بیکار یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ عنقریب تم سُن لوگے کہ ہم یہاں سے چلے جائینگے۔ اس لئے دوستانہ تمہیں لکھتے ہیں کہ تم اِدھر کا قصد نہ کرنا اور کسی ایسے سُلطان کی سرپرستی ڈھونڈھنا کہ جو قدردان سخن ہو۔ یوں ہی کسی نے تمہارا ذکر کردیا تھا تو حضرت سلطان المعظم کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ اچھا اسے بلالو مگر پھر حضور ظلّ سبحانی اور خداوند زمین و زمان نے تمہارا ذکر

بھی نہیں کیا چونکہ تم ہمارے ہم پیشہ ہو اس لیئے ہمیں تم سے محبت ہے ہم یہ ہرگز نہ چاہیں گے کہ ایسا زبردست فاضل شاعر دربار سلطانی میں آکر خفیف کیا جائے اس لیئے ہم نے یہ خط دوستانہ بھیجا ہے اور اپنی طرف سے تمام درباری رنگ صاف صاف دکھادیا ہے۔ آیندہ تمھیں اختیار ہے اگر اس طرف آنے کی جرات کروگے تو اپنی جان پر رحم کھاکر واپس چلے جاؤ۔ فقط۔ راقم عنصری و رودکی۔ عسجدی وغیرہ وغیرہ۔ جونہی یہ امر طے پایا اور مشورہ ہوا فوراً اسی مضمون کا خط فردوسی کو لکھا گیا۔ یہ بیچارہ محض بیخبر ہرات میں قیام پذیر تھا جونہی اس نے یہ افسردہ کرنے والا خط دیکھا وہ سناٹے میں آگیا۔ وہ امنگیں اور امیدوں کے جوش جو اس کی مزاج میں موجزن ہو رہے تھے سرد پڑ گئے۔ اس نے کبھی یہ مناسب نہ جانا کہ ایسے ناقدرشناس کے دربار میں حاضر ہوکر اپنی عزت ریزی کراؤں۔ اس کی خوش آیندہ آرزوں پر پانی پھر گیا اور وہ سخت مایوسی کی حالت میں گم سم رہ گیا۔ اس کے وہ دلی اور ضمیری جذبے جو اپنی ترقی اور عزت افزائی کے لمحہ بلمحہ طبیعت میں جوش مار رہے تھے ناپید ہوکر افسردہ حیرانیوں اور ٹھٹھری ہوئی مایوسیوں سے بدل گئے۔ جس کی غمناک حالت کا اصلی فوٹو نہیں اتر سکتا۔ اسی شکستہ دلی اور بجھے ہوئے دماغ سے اس نے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ یہاں سے پھر چلو۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اپنی جائے مقصود سوچ لیتا اسے ہرات کو چھوڑ دینا امر محال تھا۔ اسی شش و پنج میں اسے کئی دن گزر گئے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کا مضمون ہوا۔ اس نے سوچا کہ گورنمنٹ ہرات کے ہاں کوئی ملازمت حاصل کروں۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ جب سلطان خود شعر اشعار اور علمی باتوں سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ تو گورنر ہرات کیوں میری قدر کرنے لگا +

بیچارہ سخت پریشانی کی حالت میں اپنے دوست سید ابوالحسن کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اس اثنا میں دربار غزنی میں نیا واقعہ پیش آیا جس کی کبھی امید نہ ہو سکتی تھی۔ یعنی بدیع الدین میر منشی دربار اور عسجدی۔ عنصری۔ رودکی میں بگڑ گئی۔ یہاں تک باہمی رنجش ہوئی کہ بدیع الدین نے فوراً ایک خط ہرات میں فردوسی کو لکھا کہ جو کچھ تمھیں درباری

شعرا نے لکھا تھا وہ سوائے دھوکہ دینے والے نوٹ کے اور کچھ قیمت نہیں رکھتا اس کو تم محض لغو سمجھو اور بہت جلد دربار غزنی کی طرف روانہ ہو جاؤ کیونکہ حضرت سلطان المعظم روزمرہ دریافت فرماتے ہیں کہ ابھی فردوسی نہیں آیا۔ یہ رقعہ بدیع الدین کا دیکھتے ہی فردوسی کھل گیا اور رسید ھا غزنی روانہ ہوا۔ مگر غزنی روانہ ہونے سے پہلے فردوسی نے بدیع الدین کے رقعہ کا جواب لکھا اور جو سوار لایا تھا اسی کو دیدیا۔ پہلے بہت کچھ شکریہ ادا کیا گیا ہے پھر اپنے شوق اور قوت شاعری کا مجملاً بیان ہے بعد ازاں رقعہ میں یہ اشعار تحریر کئے ہیں :-

بگوش از سر و شم بسے مژدہا ست | دلم گنج گوہر زباں اژدہا ست
چو سنجد بمیزان من عنصری | گیا چو کشد پیش گلبن سری
ز بلبل عاشقی باشد دکود کی | کہ رائے فزونی زند رودکی۔

ادھر یہ رقعہ قاصد کو دیا اور ادھر آپ بھی منزل بمنزل روانہ غزنی ہو گیا۔ ان ہی دنوں میں محمود نے تواریخ ملوک عجم کو منظوم کرانا چاہا تھا۔ اس نیت سے اس نے کچھ کچھ مضمون سات شعرا کو جو اس کے دربار کی زینت تھے مرحمت کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کو منظوم کر لاؤ جس کی نظم پسند آئے گی اسی کو پوری کتاب کے نظم کرنے کا حکم ہوگا۔ گو محمود یہ جانتا تھا کہ میری خواہش کے مطابق ان میں سے ایک شاعر بھی نظم نہ کر سکیگا پھر بھی اس کے شوق علم نے اسے مجبور کیا کہ وہ خواہ کیسے ہی نظم میں مرتب ہو تواریخ عجم کو منظوم دیکھے۔ اس لحاظ سے اس نے شعرا کو تاکید کر دی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو ان گزشتہ واقعات کو نہایت برجستہ اور پُر زور نظم میں موزوں کرنا۔ یہ گرامی شعرا اپنے عظیم الشان فرض کی انجام دہی میں جان لڑا رہے تھے اور ہر شاعر یہ چاہتا تھا کہ میں ہی سب سے اول نمبر پاؤں۔ مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ اول نمبر کا سارٹیفکٹ زمانہ سے صرف اس شخص کو ملنا قرار دیا گیا ہے کہ جو ہم میں سے نہیں ہے۔ وہ اس سے بالکل آگاہ نہ تھے کہ ہم اس فرض کی انجام دہی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ جو شعرا کہ محمود کے دربار میں نہایت وقعت کی نگاہ

سے دیکھے جاتے تھے اور جنہیں اس دشوار فرض کی انجام دہی سپرد ہوئی تھی ان کے گرامی نام حسب ذیل ہیں :-
عنصری فرخی زینی عسجدی منجگ چنگیزن خرمی ترمذی یہ سات شاعر تھے جنہیں کچھ کچھ حصہ کہیں کہیں سے سپرد ہوا تھا۔ اگر ہم ان شعرا کی لیاقت او شاعری پر نظر ڈالیں گے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یہ سپہر سخنوری کے سات سیارے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے رنگ میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور ہر متنفس کی علمی قابلیت اعلے درجہ پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی لاثانی لیاقت کی شہادت خود محمود جیسے فاضل قدردان پر ہی ہے۔ محمود انہیں آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور ان کی بڑی بڑی تنخواہیں کر رکھی تھیں اور جتنی عزت کہ ایک لائق قدردان حکمران ایک فاضل کی کر سکتا ہے وہ ان کی محمود کے دربار میں ہوتی تھی۔ محمود کا دربار صرف شعرا ہی سے بھرا ہوا نہ تھا۔ بلکہ ہر علم و فن کے کامل اس کے دربار کے زیور بن رہے تھے۔ بو علی سینا جیسا حکیم بھی اس کا آستانہ بوس ہو چکا تھا۔ تمام ہنروں اور فنون کے ماہر حاضر خدمت رہتے تھے اور محمود ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ مشرقی شاہوں کی فہرست میں محمود کا نام بھی شامل ہے کہ جو قدردان علم و ہنر ہو گئے ہیں۔ اسی لئے فردوسی کو جرات بھی ہوئی تھی کہ وہ اس شوق سے اس کے دربار میں حاضر ہو اور طرح طرح کی آرزوؤں کے پوٹ کندھے پر رکھ کر آستان بوسی کرے۔ چنانچہ وہ پر شوق قدموں میں ہرات سے روانہ ہو کر غزنی پہنچا اور ایک باغ کے کنارہ پر اس نے اپنا قیام کیا تا کہ کچھ ساعت یہاں آرام لے۔ اور بعد ازاں کپڑے بدل کر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہو۔ اپنا اسباب رکھا ٹٹو پر سے اپنا بستر و کتابیں اُتروائیں کنار آب پر بیٹھ کر وضو کیا اور شکرانہ کی نماز پڑھی کہ بخیر و عافیت خدا نے غزنی پہنچا دیا۔ کچھ ناشتہ کیا جب ہر طرح فارغ ہو گیا تو ایک شخص کو دربار کی طرف روانہ کیا کہ فردوسی کے آنے کی خبر شہر میں مشتہر کی جائے تا کہ سلطانی سواری آئے۔ آدمی ادھر روانہ ہوا اور آپ باغ کی خنک ہوا میں پھولوں کے تختوں کے پاس ٹہلنے لگا

کی بارہ دری میں اتفاق سے عنصری فرخی عسجدی یہ تین شاعر تنہا بیٹھے ہوئے
پرائیوٹ گفتگو کر رہے تھے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے شہر کی چقلش سے
آکر پناہ لی ہے۔ فردوسی ٹہلتے ٹہلتے جو اُدھر پہنچا تو اس کی نگاہ ان تین شخصوں پر پڑی
چونکہ یہ پردیسی تھا اس لئے اس نے یہ چاہا کہ آؤ ان ہی سے جب تک کوئی سلطانی
سواری آئے دو چار باتیں کرو شاید اور کچھ بدیع الدین اور عسجدی وغیرہ کی نئی کیفیت
معلوم ہو۔ دربار کا حال کھلے کہ کس نہج پر ہے یہ سوچ کر فردوسی بارہ دری کی طرف
بڑھا اور ادھر ان تین شعرا نے اس کی طرف دیکھا۔ انہیں بُرا معلوم ہوا کہ یہ معمولی شخص
ہماری خوش صحبت میں مخل ہونے کیوں آتا ہے اس اجنبی کو دیکھ کر ان پر ایک بے
چینی سی طاری ہو گئی۔ عنصری نے تو یہ کہا کہ ملازم سے کہدیا جائے کہ یہ اجنبی یہاں
نہ آنے پائے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں یہ لغو بات ہے آنے دو مگر مُنہ نہ لگاؤ۔
خود بخود چلا جائیگا۔ تیسرے نے کہا یہ ساری باتیں خلاف انسانیت اور وحشی پنے
کی ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم خندہ پیشانی سے اس کے آنے پر مبارکباد دیں اپنے
پاس بٹھائیں اور اس کا دل اپنی کسی حرکت سے آزردہ نہ ہونے دیں۔ ہاں صرف
ہم تین شخص تین مصرعے کہیں اور اس سے التجا کریں کہ چوتھا وہ بھی کہے غالباً اس سے
نہ کہا جائیگا۔ جب نہ کہا جائے تو ہم اسے صاف کہدیں کہ ہم شعراء دربار ہیں ہمیں شاہ
کا حکم ہے کہ فلاں گزشتہ واقعہ کو منظوم کرو تو ہم اپنا وہ فرض انجام دے رہے ہیں
بہتر ہوگا اگر آپ ہم سے فرصت کے وقت ملیں گے۔ بس یہ آدمیت اور تہذیب کی
بات ہے ہمیں اس سے نجات بھی ہو جائے گی اور اس کا دل بھی نہ دکھیگا۔ تینوں
نے اس بات پر اتفاق کیا۔ اتنے میں فردوسی نے آکر سلام علیکم کیا سب اٹھ کھڑے
ہو گئے اور بخندہ پیشانی اس کے پیش آئے۔ پہلے دو تین ادھر اُدھر کی باتیں ہیں
بعد ازاں مصرعہ بازی ہوئی۔ پہلے عنصری نے کہا ؎ چوں عارض تو ماہ نباشد روشن
پھر فرخی نے گوہر فشانی کی ؎ مانند رخت گل نبود در گلشن ؎ اس کے بعد عسجدی نے
یہ گوہر پروئے ؎ مژگانت گزر ہمی کنند در جوشن۔ یہ تین مصرعے کہکر فردوسی

کی طرف استدعائے نظروں میں تکنے لگے۔ جب فردوسی نے ان کی نظروں کو دیکھا تو یہ گویا ہوا "کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ چوتھا مصرعہ میں موزون کردں؟" انہوں نے جواب دیا۔ ہاں ہماری یہ التجا ہے کہ چوتھا مصرعہ آپ موزون کریں۔ یہ سنتے ہی فردوسی نے اسی وقت یہ مصرعہ کہا۔ "مانند سنان گیو در جنگ پشن" یہ سنتے ہی ان کے حواس باختہ ہو گئے اور وہ پریشان نظروں سے فردوسی کو تکنے لگے اور ہکا بکا رہ گئے انہیں سخت صدمہ ہوا کہ ایک اجنبی نامعلوم الاسم نے ان کی ہمسری کی۔ بااین ہمہ انہوں نے اپنے کو ضبط کیا اور اپنے چہروں پر ملال نہ ظاہر ہونے دیا اور فردوسی سے گیو اور پشن کی بابت دریافت کیا کہ اس کا بیان کیونکر ہے فردوسی نے فرافسارا واقعہ سنا دیا پھر انہوں نے شاعری پر نئے نئے اور مشکل سوال کئے فردوسی نے سب کے جواب دیئے گفتگو میں انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ فردوسی ہے ان کے چھکے چھوٹ گئے اور اب انہیں یقین ہو گیا کہ ضرور ہماری وقعت اور عزت میں فرق آئیگا۔ انہوں نے مکر سے اپنا نام نہ بتایا لیکن ان کے باغ سے چلے جانے پر فردوسی کو ایک شہری کی زبانی معلوم ہو گیا کہ یہ تین شعراء تھے۔

ان ناخدا ترس غیر منصف شعرا نے کوشش کی کہ فردوسی باریاب نہ ہو سکے جس شخص کو فردوسی نے بھیجا تھا کہ درباریوں میں سے کسی کو خبر کرے اس کو بھی بہکا دیا گیا تھا۔ ایک دن اور رات تو فردوسی نے دستہ دیکھا بعد ازاں بیچارہ ایک سرا میں مقیم ہو گیا۔ فردوسی نے یہ کوشش کی کہ بدیع الدین سے ملوں لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ کسی تحقیق کے لئے کل ہی قندھار روانہ ہوا ہے۔ اس خبر سے اور بھی فردوسی کا دل افسردہ ہو گیا اور اس نے اپنی ناکامی کی تصویر اپنی آنکھوں کے آگے پھرتی ہوئی دیکھی۔ شاہی دربار میں پہونچنا بغیر کسی بڑے زبردست توسط کے محال تھا دوسرے تمام شعرا اس کوشش میں ہے کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے یہ اور بھی ظلم تھا جو شخص عرض کرنا چاہتا تھا اسے یہ منع کر دیتے تھے۔ اسی اثنا میں فردوسی کی خبر عوام میں مشہور ہونے لگی اور پندرہ سولہ دن میں خواص کے کانوں

میں بھی اس کی شہرت کے آوازے گونجنے لگے۔ چنانچہ پہلے جس شخص نے سُنا وہ مصاحب سلطان ماہک نامی تھا۔ وہ سنتے ہی فردوسی کی قیام گاہ پر آیا اور بڑی عزت سے اپنے مکان پر لے آیا اس کا ہر طرح اطمینان کیا اور کہا تم گھبراؤ نہیں میں تمہیں بارگاہ سلطانی میں پہنچا دونگا +

فردوسی نے اتنی پریشانی کے بعد یہاں آرام پایا۔ نوکر چاکر خدمتگار مکان تمام راحت کے سامان مہیا۔ اس سے زیادہ فردوسی کو اور چاہیئے ہی کیا تھا سوا اس کے کہ وہ سلطانی دربار کے آستانہ پر جبیں نیاز رگڑے۔ ماہک نے دربار اور اہل دربار کی کیفیت سے آگاہ کیا اور شعرا کا بھی تذکرہ کیا کہ آج کل فلاں فلاں حصہ تواریخ عجم کا منظوم کر رہے ہیں۔ یہ سن کر فردوسی کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اپنے شفیق میزبان سے کہا اگر میں باریاب بارگاہ سلطانی ہو جاؤں اور حضرت سلطان المعظم کا مجھے اشارہ ہو۔ تو میری مراد حاصل ہو اور میں شاعری کی پوری بانگی دکھاؤں اور بتاؤں کہ واقعات کو منظوم یوں کیا کرتے ہیں +

اس میں شک نہیں کہ فردوسی کی جودت طبع ان شعرا کو جنہیں دربار میں بہت عروج حاصل تھا کچھ حال نہ سمجھتی تھی۔ وہ مغرور نہ تھا بلکہ اس کی علمیت اور لاثانی لیاقت سے یہ کہنے پر مجبور کرتی تھی۔ سر جارج ہملٹن کا یہ ریمارک فردوسی کی نسبت بہت درست ہے کہ اور شعرا سوچ سوچ کر اشعار موزون کرتے تھے اور وہ اسی وزن کے اشعار بدیہہ کہدیا کرتا تھا اور اسے ذرا بھی تکلیف نہ کرنی پڑتی تھی۔ تمام شاہنامہ پر ایک نظر ڈال جاؤ آورد کا نام بھی ایک مصرعہ میں نہ معلوم ہو گا۔ سر جارج ہملٹن نے اس کی توصیف میں سے یہ اشعار انگریزی میں ترجمہ کر کے لکھے ہیں۔ جو ہدیہ ناظرین ہیں +

چو گشتے باسپ بدیہہ سوار۔ برآوردے از خیل فکرۃ دمار۔ برجمع سخن در صف ارتجال شکستے بیک حملہ قلب رجال + فردوسی کو ماہک کے پاس آنے سے اطمینان تو ہوا لیکن اسے گرید یہ رہی کہ کیونکر سلطان محمود کے پاس پہنچوں گا اور شعرائے دربار

میں میرا نام کب لکھا جائیگا۔ آخر ایک دن عنصری نے سلطان محمود سے عرض کیا کہ رستم وسہراب کی داستان نظم ہو گئی۔ حضور اجازت دیں تو حاضر خدمت کروں۔ حکم ہوا کہ لاؤ۔ کل شعرا اور درباری جمع تھے وہ نظم پڑھی گئی محمود کو بہت پسند آئی اور اس نے عنصری ہی کو شعرا میں اول نمبر گنا۔ دربار سے خلعت اور نقد روپیہ ملا اور نہایت عزت سے عنصری رخصت کیا گیا۔ ماہک نے شام کو فردوسی سے یہ ساری کیفیت بیان کی فردوسی نے کہا کہ تجھے ایک آدھ شعر یاد بھی ہے اس نے دو شعر فردوسی کو سنائے جو حسب ذیل ہیں +

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں پیالودی از خنجر آب گوں

زمانہ بخون تو تشنہ شود باندام تو موے دشنہ شود

پھر ماہک نے کہا کہ یہ اس موقعہ کے شعر ہیں کہ جب رستم نے دھوکا دیکر سہراب کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور اس نے قتل سہراب کا ارادہ کیا تو سہراب نے اس نظر سے کہ میں نے اُسے چھوڑ دیا تھا اور یہ ظالم مجھے نہیں چھوڑتا یہ حسرت ناک الفاظ بددعا کے طور پر مذمت کے لباس میں زبان سے نکالے +

فردوسی نے کہا اگر تو صلاح دے تو میں رستم اور افراسیاب کی جانکاہ اور حیرت افزا واقعہ کو منظوم کروں۔ ماہک نے تعجب خیز لہجہ میں دریافت کیا کیا تیرے پاس تاریخ شاہان عجم ہے۔ فردوسی نے اپنے صندوق میں سے نکال کر وہ تاریخ دکھائی۔ ماہک بہت خوش ہوا۔ اور اس نے فردوسی کو مشورہ دیا کہ وہ ضرور اس واقعہ کو منظوم کرے۔ چنانچہ فردوسی نے چند روز میں اس واقعہ کا کچھ حصہ منظوم کیا تھا کہ ماہک نے ایک دن موقعہ پاکر سلطان المعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے ماہک سے دریافت کیا۔ کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔ ماہک نے فردوسی کی کیفیت عرض کی۔ سلطان محمود خفت کے ساتھ خوش ہوا اور اس نے کہا کہ ہم نے فردوسی کو بلایا تھا افسوس ہے کہ اب تک اس کے آنے کی ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کل ضرور اسے دربار میں حاضر کرنا۔ اسی دن سے محمود نے ایک صندوق محل کے دروازہ پر رکھوا دیا

اور حکم دیدیا کہ جو شخص کوئی فریاد کرے یا عرض معروض کرنا چاہیئے اپنی تحریری عرضی اس صندوق میں آکر ڈال جائے۔ محمود نہایت رحیم اور کریم فطرت کا شخص تھا۔ انصاف اس کی گھٹی میں آمیز ہو چکا تھا جہاں تک اس کے فیصلے دیکھے گئے ہیں ہم ان سے یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ اس کی قلم سے نامنصفانہ تحریریں بہت ہی کم نکلتی تھیں۔ دوسرے دن فردوسی پیش کیا گیا۔ سلطان نے صورت دیکھتے ہی اس سے معذرت کی اور معافی چاہی۔ فردوسی اور بھی تعریف میں جھک گیا اور آداب دربار بجالایا۔ پھر محمود نے فردوسی کو حکم دیا کہ تو خود مجھے رستم اور اسفندیار کی منظوم داستان سنا۔ فردوسی نے نہایت خوش لہجہ میں پڑھ کر سنائی۔ محمود بہت خوش ہوا اور خلعت فاخرہ سے ممتاز کیا۔ پھر محمود نے دریافت کیا کہ تیرا اصلی وطن کہاں ہے۔ عرض کیا گیا کہ طوس۔ ارشاد ہوا کہ طوس کس نے آباد کیا تھا فردوسی نے اس سوال پر دست بستہ یہ گذارش کی۔ یہ مقام طوس دراصل طوس پسر نوذر کا آباد کیا ہوا ہے۔ اور یہ واقعہ تواریخ عجم میں یوں بیان ہوا ہے کہ جب کیخسرو نے طوس نوذر کو افراسیاب سے جنگ کرنے کے لئے ترکی افغانی کی طرف روانہ کیا تو یہ ہدایت کردی تھی۔ کہ راہ قلات سے نہ جائیو۔ اس لئے کہ میرا بھائی فرود نامی دختر پیران ویسہ سے وہاں مقیم ہے اور سر کوہ پر ایک گھاٹی میں رہتا ہے۔ چونکہ وہ تند و تیز اور سودائی مزاج ہے خوف ہے کہ تجھ سے جنگ پر آمادہ ہو جائے اور پھر خون خرابہ اگر واقع ہوا۔ میرا بھائی چشم زخم اٹھاوے۔ یہاں تو طوس نے یہ اقرار کر لیا تھا کہ جو کچھ حضور نے ارشاد کیا ہے اس کے خلاف نہ ہوگا لیکن بعد ازاں اُس نے عدول حکمی کی اور راہ قلات سے جاکر روانہ ہوا۔ جب اس گھاٹی کے قریب پہنچا۔ تو فرود آمادۂ جنگ ہوا اور کہا کہ یہاں سے ہیں طوس کو نہ جانے دونگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہم جنگ ہوئی اور آخر فرود مارا گیا۔ کیخسرو کو اپنے مختلف البطن بھائی کے قتل ہونے کی خبر جب پہنچی اس نے سخت ماتم کیا اور کہا کمبخت طوس کو میں نے بھیجا تھا کہ میرے باپ کے خون کا عوض افراسیاب سے لے اس بدبخت نے اُلٹا میرے بھائی کو مار ڈالا۔ دربار سے سخت عتاب کا ایک فرمان روانہ ہوا طوس نے فرمان کو دیکھ کر ترکی افغانی سرحدوں کی طرف بڑھنا چاہا نہ اپنے شاہ کے دربار میں حاضر ہونا مناسب جانا۔

تھوڑی دور واپس آکر اس نے اس شہر کی بنیاد ڈالی اور اپنے نام سے اسے آباد کیا کیونکہ یہاں کا نیچرل سین اسے بھا گیا۔ جب سے یہ شہر آباد ہے اور اس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سن کر محمود خوش ہوا اور اس نے فردوسی کی اس واقفیت پر مرحبا کہا۔ اور مبارکباد دی اور حکم دیدیا۔ کہ روز بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا کرے۔ دوسرے دن کے لئے چوبدار کو حکم دیدیا گیا کہ کل شاعر حاضر دربار ہوں تا کہ فردوسی کے اشعار گوش گذار کریں۔ فردوسی نے اپنی پہلی باریابی کا حال سلطانی بارگاہ میں اس طرح لکھا ہے :۔

چو خورشید خرگاہ بنمود تاج — زمیں شد بکردار تابندہ عاج
چہ گوئی کہ خورشید تاباں کہ بود — کزو در جہاں روشنائی فزود
ابوالقاسم آن شاہ پیروز بخت — نہاد از بر تاج خورشید تخت
زخاور بیاراست تا باختر — پدید آمد از فر او کان زر
مرا اختر خفتہ بیدار گشت — بمغز اندر اندیشہ بسیار گشت
چو دانستم آمد زبان سخن — کنوں نو شود روزگار کہن
بر اندیشۂ شہریار زمیں — بخفتم شبے دل پر از آفریں
دل من چو نور اندریں تیرہ شب — نخفتہ کشادہ دل و بستہ لب
چناں دید روشن روانم بخواب — کہ رخشندہ شمعے بر آمد ز آب
ہمہ روئے گیتی شدہ لاجورد — ازاں شمع گشتی چو یاقوت زرد
در و دشت برساں دیبا شدے — یکے تخت پیروزہ پیدا شدے
نشستہ برو شہریارے چو ماہ — یکے تاج بر سر بجائے کلاہ
ز دلبر کشیدہ سپہ از دو میل — بدست چپش ہفت صد ژندہ پیل
یکے پاک دستور پیشش بپاے — بداد و بدیں شاہ را رہنمائے
مرا خیرہ گشتی سر از فر شاہ — وزاں زندہ پیلان و چندیں سپاہ
چو آں چہرہ خسروی دیدمے — ازاں نامداراں بپرسیدمے
کہ ایں چرخ ماہست یا تاج گاہ — ستارہ ست پیش اندرش یا سپاہ

یکے گفت ایں شاہ روم ست و ہند | ز قنوج تا پیش دریائے سندھ
بایران و توران ورا بندہ اند | برائے بفرماں او زندہ اند
بیاراست روئے زمیں را بداد | بپرداخت زاں تاج بر سر نہاد
جہاندار محمود شاہ بزرگ | بآبشخور آید ہمے میش و گرگ
ز کشمیر تا پیش دریائے چیں | بروشہریاران کنند آفریں
چو کودک لب از شیر مادر بشست | بگہوارہ محمود گوید نخست
تو نیز آفریں کن کہ گوئندۂ | بدو نام جاوید جوئندۂ
نہ پیچد کسے سر ز فرمان او | نیارو گذشتن ز پیمان او
چو بیدار گشتم بجستم ز جائے | چہ مایہ شب تیرہ بودم بپائے
براں شہریار آفریں خواندہ ام | نبودم درم جاں برافشاندہ ام
بدل گفتم ایں خواب را پاسخ است | کہ آوازہ اش در جہاں فرخ است
بروآفریں گو کنند آفریں | براں بخت و بیدار تاج و نگیں
ز فرش جہاں شد چو باغ بہار | ہوا پر ز ابر و زمیں پر نگار
ز ابر اندر آمد بہنگام نم | جہاں شد بکردار باغ ارم
بایراں ہمہ خوبی از داد اوست | جہاں شادماں از دل شاد اوست
ببزم اندروں آسمان وفاست | برزم اندروں تیز دم اژدہاست
بہ تن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل | بہ کف ابر بہمن بدل رود نیل
سر بخت بدخواہ با خشم او | چو دینار خوار است بر چشم او
نہ کند آوری گیرد از تاج و گنج | نہ دل تیرہ دارد ز رزم و ز رنج
ہر آنکس کہ دارد ز پروردگاں | از آزادہ و از نیکدل بردگاں
شہنشاہ را سر بسر دوستدار | بفرماں بہ بستہ کمر استوار
شدہ ہر یکے شاہ ہر کشورے | رواں نام شاں بر ہمہ منبرے

یہ اشعار اول ہی دن سلام کرکے فردوسی نے دربار میں پڑھ کر سنائے اور بعد ازاں

رستم اور اسفندیار کی داستان اشعار پڑھی اس دن تو خوشی خوشی فردوسی رخصت ہوکر چلا آیا اور دوسرے دن جس وقت دربار میں حاضر ہوا تو تمام شعرا کو دست بستہ کھڑا ہوا ملاحظہ کیا سلطان المعظم کا ارشاد ہوا کہ ان شعرا کو بھی اپنے اشعار سنا۔ حکم ہوتے ہی فردوسی نے سُنائے اشعار کا سننا تھا کہ سب سے زیادہ عنصری بیتاب ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ خاموش کھڑا رہے لیکن نہ رہا گیا۔ اور اس نے دوڑ کر فردوسی کے لبوں پر بوسہ دیا۔ اِس کے ہاتھ چومے اور بیساختہ اس کی زبان سے یہ سرزد ہوا:

سخن گرچہ آید ز چرخ بلند	تو بازش براں بردی اے ہوشمند
تو دادی دریں عصر داد سخن	کہ بادی ستودہ بہر انجمن
نمودہ ہنر عنصرت بے شمار	بماند چو نامت سخن یادگار
تو شاہنشہ ملک نظم دری	بہ بندت بہ پیشت کمر عنصری

چاروں طرف سے مرحبا و صد مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اور ہر شخص واہ واہ کرنے لگا سب سے زیادہ محمود خوش تھا کہ اسے ایسا شاعر ہاتھ لگ گیا۔ آخر محمود نے حکم دیدیا کہ کل تواریخ عجم فردوسی ہی نظم کرے:

فردوسی کا شاہنامہ تصنیف کرنا اور رنجش

یہ مسلمہ امر ہے کہ علم اور لیاقت انسان کی سلاطین کی بارگاہ میں خود سفارشی بن جاتی ہے۔ محمود جو علما اور فضلا پر مٹا ہوا تھا اس قدر فردوسی کے آنے سے خوش ہوا کہ پھولا نہ سمایا۔ ایک دن چند بیتیں محمود نے پڑھیں اور شعرا سے چاہا کہ ایاز کی تعریف میں اسی مضمون پر کچھ کہیں۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ فردوسی کے آگے زبان کھولتا۔ سب نے متفق ہوکر فردوسی کی طرف اشارہ کیا۔ فردوسی نے فی البدیہ دو تین بیتیں عرض کیں اور وہ یہ ہیں:

مستست بتا چشم تو و تیر بدست	بس کس کہ ز تیر چشم مست تو نخست

گر پوشد عارضت زرہ عارضش ہست　　　　گز تیر بتر سد ہمہ کس خاصہ زمست

یہ دو بیتیں سلطان کو اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ وہ نہایت انبساط سے سرگرمانہ الفاظ میں یہ گویا ہوا۔ "للہ درک یا فردوسی کہ مجلس ما را چوں فردوس منور ساختے"۔ یہ تعریفی الفاظ ایسے زبردست حکمران کی زبان سے فردوسی کے حق میں سوائے اس کے اور کچھ ثابت نہیں کرتے کہ فردوسی ایک غیر معمولی لیاقت کا شخص تھا۔ اور نظم میں اُسے وہ دستگاہ حاصل تھی کہ نہ کسی کو ہوئی اور نہ ہوگی۔ دوسرے سلطان المعظم کی انتہا درجہ کی علم دوستی معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ علما پر کیسی جان فدا کرتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے محلوں میں فلاں محل جو ہماری خوابگاہ کے قریب ہے فردوسی کے لئے آراستہ کیا جائے اور تمام سامان تفیش وہاں مہیا ہوں۔ فردوسی نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں تمام آلات حرب وہاں موجود ہوں اور گزشتہ شاہوں کی بڑی قد آدم تصویریں کھینچی جاویں۔ محمود نے حسن میمندی کو حکم دیا کہ فردوسی کی خواہش کے مطابق سب تیاری ہو جائے۔ حکم کی دیر ہی تھی کہ ہر شے فردوسی کی رائے کے موافق تیار ہو گئی۔ اب فردوسی شاہ نامہ تصنیف کرنے بیٹھا۔ سوائے ایاز اور حسن میمندی کے پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ چند خدمتگار تھے۔ جو سلطان کی طرف سے مقرر ہوئے تھے۔ ایاز فردوسی کو باپ کہا کرتا تھا اور وہ اسے اپنا فرزند سمجھتا تھا۔ سلطان نے حسن میمندی کو حکم دیا تھا کہ جب ہزار بیتیں فردوسی تصنیف کر لیا کرے تو ہزار اشرفی فوراً دیدیا کرو۔ یہ ہزار اشرفیاں وہ تھیں کہ جو تنخواہ سے علیحدہ بطور انعام کے دئیے جانے کا حکم ہوا تھا۔ ایک دن دربار میں کل شعرا کی نظموں کا ذکر ہو رہا تھا محمود نے اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے:۔

نامہ ہا داستان شنیدہ ام اما نظم فردوسی چیزے دیگر است و عبارات او را یا اثر دیگر است او در رزم و بزم وغیرہ از سخن او فصاحت و مفاخرت و دلیری و مروت و تہور و عیش و طرب مے انگیزد در مقام ضعف و کسر و حسرت و تحزن او رقت و تحبن مے آورد و در ہمہ حال تسکین طبع و تسلی

خاطر نمودم میکند ۔

یہ ریمارک خاص سلطان محمود کا فردوسی کے اشعار کی نسبت ہے - ان تمام باتوں سے یہ کھلتا ہے کہ فردوسی پر محمود فریفتہ تھا اور اس طرح جوش اور جذبہ میں اس کی مدح کرتا تھا کہ آج تک کسی کو یہ نصیب نہ ہوا تھا کہ محمود جیسے سلطان سے ایسی مدح کرا سکے اور جبراً اس کا دل اپنی طرف کھینچ لے ۔

فردوسی شاہ نامہ کی تصنیف میں مشغول ہوا اس عرصہ میں اس کا استغنا بڑھتا گیا اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ گستاخانہ بے پروائی رنگینی اس کی طبیعت میں آگئی جو اس کے لئے ہرگز زیبا نہ تھی - اس نے یہ نہ جانا - کہ جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے یہ محض انکساری اور عاجزی سے - سرکشی سے اس نے کوئی بات حاصل نہ کی تھی مگر پھر بھی افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی اس حالت کی طرف متوجہ نہ ہوا اور دن بدن اس بری عادت کو بڑھاتا گیا - گو اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ساری حسن میمندی کی شرارت تھی پھر بھی اسے بہت کچھ ضبط کرتا تھا شاہ نامہ تصنیف ہونے کے درمیان جس بات پر حسن میمندی اور فردوسی کی بگڑ گئی - وہ درج ذیل کی جاتی ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ سلطان محمود بالکل بے قصور تھا حسن میمندی درباری وزرا میں سے تھا اور اس کی بہت بڑی عزت تھی - جس کو سر جارج ہلٹن اور عظیم سمرقندی نے فارن سیکرٹری لکھا ہے - اور یہی فردوسی کی خدمت کے لئے مقرر ہوا تھا - یعنے تمام انتظام اسی کے سپرد تھا - سلطانی حکم ہو گیا تھا کہ فردوسی کو جس چیز کی ضرورت ہو حسن میمندی فوراً اس کے بہم پہنچانے کی کوشش کرے - فردوسی دراصل سنی تھا - لیکن پھر بھی شیعہ مذہب کا اثر کچھ نہ کچھ اس کی طبیعت پر باقی تھا - عظیم سمرقندی لکھتا ہے کہ تفضیلیہ تھا - خیر کچھ ہو ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ ہم اُسے شیعہ مان لیں - با ایں ہما اہلبیت کی پاک محبت کے نقوش اس کے دل پر گہرے گہرے ہو رہے تھے - وہ خوارج کا دلی دشمن تھا اور ان سے نفرت کیا کرتا تھا - حسن میمندی اصل میں تو خارجی تھا لیکن بظاہر وہ سنی المذہب بنا ہوا تھا

اور اس کے دل میں فردوسی کے مقابلہ میں اہلبیت سے عداوت تھی۔ مگر ایک وقت تک فردوسی کو یہ ظاہر نہ ہوا کہ حسن میمندی خارجی ہے اس کے خلاف حسن میمندی کو بخوبی معلوم تھا کہ فردوسی شیعہ ہے حالانکہ وہ شیعہ نہ تھا حسن میمندی اول ہی دن سے فردوسی سے دلی عداوت رکھتا تھا اور وہ اس واقع کی تلاش میں تھا کہ فردوسی چشم اعتبار سے گرا دیا جائے۔ اسی اثنا میں فردوسی کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ حسن میمندی خارجی ہے یہ خیال آنا تھا کہ فردوسی کو سخت نفرت ہونی شروع ہوئی اور اس نفرت کے آخر کار نمایاں آثار صورتوں پر ہویدا ہونے لگے۔ پھر بھی فردوسی اپنے عظیم الشان فرض کی انجام دہی میں کچھ ایسا سرگرمی سے مصروف تھا کہ اسے عداوت کرنے اور دشمنی کا پہلو سوچنے اور حریف کو زک دینے کے خیال کرنے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ دوسرے فردوسی میں اپنے علم کے زور پر گھمنڈ اس قدر تھا کہ وہ حسن میمندی کو کچھ مال نہ سمجھتا تھا اور ذرا بھی نہ جانچتا تھا کہ یہ مجھے کچھ اذیت دے سکیگا۔ فردوسی کی اس بیخبری اور بیجا تجنتری نے اُسے آخر پشیماں کیا۔ اور اُسے آیندہ بہت کچھ دقتیں اُٹھانی پڑیں۔

حسن میمندی شب و روز تاک میں لگا رہتا تھا کہ کوئی موقعہ ایسا نکلے تو فردوسی کو نیچا دکھاؤں مگر وہ جلدی اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فردوسی کو انتظام امور جہانداری کی کوئی شاخ سپرد نہ تھی کہ اس سے خواہ مخواہ لغزش ہوتی اور وہ ماخوذ ہوتا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ اس میں قدم رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ بھلا یکایک وہاں حسن میمندی کی دشمنی کیا چل سکتی تھی۔ فردوسی کا قاعدہ تھا۔ کہ جمعہ کے دن بالکل کام نہ کرتا تھا گویا یہ دن چھٹی کا تھا۔ اس دن اسے امرائے ملنا باغوں میں جانا شکار کھیلنا یہ ساری تفریح کی باتیں امرا کے ساتھ ملکر فردوسی کیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ میں فاضل شاعر کا اکثر امرا سے تعارف ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جب دو شخصوں میں دوستی ہو جاتی ہے تو ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق تحفے پیشکش کیا کرتا ہے۔ امرا فاضل شاعر کو قیمتی قیمتی سوغاتیں دیتے اور فاضل شاعر

اس کے بدلے میں کچھ اشعار ان کی مدح میں موزون کر کے پیشکش کر دیتا حسن میمندی نے دل میں سوچا کہ میں ایک رکن اعلیٰ ہوں اور دوسرے ہر وقت اس کی خدمتگذاری کے لئے حاضر رہتا ہوں اس نے میری مدح میں کبھی ایک شعر بھی نہیں لکھا اور ادِھر اُدھر اپنی تیزی طبع کی بانگی دکھاتا پھرتا ہے۔ یہ خیال گو ایک کمینہ اور ادنے خیال تھا۔ لیکن پھر بھی حسن میمندی کے دل پر ایک اہم اور پیچیدہ اور قابل غور امر کی صورت میں نقش ہوگیا۔ اور وہ اسے ایک بڑا کام یا عظیم الشان فرض سمجھتا تھا کہ کسی طرح فردوسی سے اس توہین کا انتقام لوں +

شاہنامہ کی تکمیل فردوسی کی محمود سے ناراضگی اور اس کا کوچ

ایک دن حسن میمندی بخندہ پیشانی عاجزانہ ہئیت بنا کر فردوسی کے پاس آیا اور ادھر اُدھر کی باتیں اس کی صفت و ثنا کے ساتھ کرنے لگا مگر بعض الفاظ حسن میمندی کی زبان سے ایسے بھی نکل گئے جو فردوسی کو ناگوار گذرے۔ یہاں تک کہ اُسے جوش آگیا اور وہ یہ گویا ہوا" مجھے اپنی لیاقت اور قابلیت پر ناز ہے۔ محمود پر کیا مقرر ہے جہاں جاؤں گا میرا علم مجھے آسمان عزت پر بٹھائیگا۔ مجھے ہرگز کسی کی پرواہ نہیں ہے" دیہ سنتے ہی حسن میمندی خوش ہوا اور اب اسے پورا یقین ہوگیا کہ فردوسی کا دام میں پھنسنا کوئی بات ہی نہیں ہے حسن میمندی نے فردوسی کے خلاف کہکر اور بھی اُسے گرمایا یہاں تک کہ فردوسی کی زبان سے بیساختہ یہ نکل گیا جو اس کے حق میں بہتر اثر کرنے والا نہ تھا۔ جس نے فردوسی کی تباہی کی بنیاد قائم کردی +

من پیش کز مبادی فطرت نبودہ ام — مایل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن میمندی نے فردوسی سے اپنی اطاعت کرانی چاہی تھی اور یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ فاضل شاعر نے یہ اشعار حسن میمندی کے پیچھے تصنیف فرمائے ممکن ہے کہ فاضل شاعر کے کسی دوست نے حسن میمندی کی سفارش کی ہو۔ اس پر اس نے یہ اشعار تصنیف کئے ہیں اپنے فاضل شاعر پر فخر ہے کہ اس نے کس اولوالعزمی سے اپنے عالی ہمم طبیعت کا فوٹو کھینچ دیا اور ذرا بھی کسی کسی کی پرواہ نہ کی گو شخصی حکومت کی مصلحت اس قول کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ فاضل شاعر کا استغنا اپنے علم اور لیاقت پر پورا بھروسہ ظاہر کرتا ہے۔ اس مذکورہ بالا قطعہ کے ہر ہر لفظ سے بیساختگی غضب کی ٹپکتی ہے اور یہ صاف کھلتا ہے کہ بناوٹی اشعار نہیں ہیں بلکہ فاضل شاعر کی طبیعت نے مجبور کیا کہ وہ یہ زبان سے نکالے یہاں تو بے اختیاری کی یہ کیفیت ہے اور وہاں حسن میمندی اپنے موقع کی تاک میں تھا کہ ڈھب بنے تو بادشاہ کے کان میں فردوسی کی اس مغرورانہ طبیعت کا نقشہ کھینچوں *

باہمی مخالفت نے اس قدر طول کھینچا کہ اکثر اہل دربار کو معلوم ہو گیا کہ فردوسی اور حسن میمندی کی چشمک رہی ہے۔ چونکہ امرا اور وزرا فردوسی کو زیادہ عزیز رکھتے تھے اس لئے انہیں گوارا نہ تھا کہ فردوسی کو کوئی چشم زخم پہنچے۔ وہ سب ایک دن جمع ہو کر فردوسی کے پاس آئے اور یہ چاہا کہ دونوں کی مصالحت کرادی جائے انہوں نے اگر اونچ نیچ دکھائی حسن میمندی کا اختیار اور درباری عزت بیان کی اور یہ کہا۔ ہمارے خیال میں کسی طرح بہتر نہیں ہے کہ تو حسن میمندی سے عداوت رکھے۔ یہ مانا کہ تیرا وہ کچھ کر نہیں سکتا پھر بھی شاہ اور دربار پر اس کا بہت اثر ہے۔ مبادا بیٹھے بیٹھے تجھے کچھ گزند پہنچے اور ہمارے دلوں پر صدمہ کی چوٹ لگے تو خواہ کوئی عذر پیش کر بہر حال ناراضگی اور عداوت سے میل جول زیادہ مفید ہے۔ اس کے جواب میں فردوسی نے کہا کہ ابھی تک حسن میمندی نے میرا کوئی نقصان نہیں کیا میری کسی قسم کی مخالفت نہیں کی۔ اس لئے ظاہرا کوئی وجہ حسن میمندی سے ناچاقی اور نفرت کی نہیں معلوم ہوتی مگر

میں اپنی دلی کرید کو کیا کروں جو لمحہ بلمحہ اس کی طرف سے میرے دل میں اٹھتی ہے۔ اور جس وقت اس کی صورت دیکھتا ہوں میری آنکھوں میں خوں اتر آتا ہے۔ فردوسی کی اس گفتگو کو مصالحہ کرانے والوں نے بغور سنا وہ سمجھ گئے کہ دنیاوی وجہ سے دشمنی نہیں ہے صرف دینی معاملات کی وجہ ہے اس پر بھی اُنہوں نے فردوسی کو خوب سمجھایا اور جتنا ان سے ہوسکا زمانہ کا اونچ نیچ دکھایا۔ بھلا وہاں یہ باتیں ذرا بھی اثر کرنے والے نہ نہیں۔ فردوسی نے آخر کار بگڑ کر انہیں یہ جواب دیا +

بدل ہر کہ بغض علی کرد جائے | زمادر بود عیب آں تیرہ رائے
کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ | اگرچند باشد بایوان گاہ
ز میمندی آئین مردی مجوی | ز نام و نشانش مکن جستجو

ناچار جو درباری سمجھانے گئے تھے وہ اُٹھ کر چلے آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ مذہبی عداوت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ رفتہ رفتہ یہ اشعار حسن میمندی کے کان تک پہنچے وہ اور بھی برافروختہ ہوا اور اب اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی بیخ کنی کی جائے مگر وہ ظاہرا کوئی موقع ایسا نہ پاتا تھا کہ جو اس کے لئے کامیابی کی خوشخبری سناتا حسن میمندی کا انفلیوائینس درباریوں پر خصوصاً گروہ علما پر بہت زیادہ تھا۔ اس نے اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے کے لئے علما اور بعض درباریوں کو فردوسی کی طرف سے بھکانا شروع کیا اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہیں اپنی طرف کرلیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایسی صورت میں ملائی دماغ زیادہ متعصب بن جاتا ہے کیونکہ اس گروہ میں بعض اس فطرت کے ہوتے ہیں کہ اسلام اور اس کی حقیقت کو صحیح صحیح سمجھ سکتے ہیں مگر اکثر نہیں جانتے کہ اسلام کا مفہوم کیا ہے اور اس کی اصلی حقیقت کیا ہوتی ہے اب فردوسی پر چاروں طرف سے مذہب کی ٹٹی کی آڑ میں حملے ہونے لگے۔ اور نئی نئی باتیں اس پر چھٹنے لگیں۔ اس کے اشعار میں سے جو محض شاعرانہ رنگ دبو سے پُر تھے نئے نئے نتائج نکلنے لگے۔ اور ان پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ فلسفی ہے جب فلسفی ہوا تو اسے اسلام سے کچھ سروکار نہیں ہوسکتا

کوئی اسے معتزلہ کہتا تھا اور کوئی اس بیچارہ کو رافضی گردانتا تھا مگر درحقیقت وہ ان سب الزامات سے پاک تھا اور اس کا سیدھا سادہ اسلامی مذہب تھا۔ جو لوگ اسے فلسفی کہتے تھے وہ اپنی تائید میں اس کے یہ اشعار پیش کرتے تھے ؛

نگہ کن بدین گنبد تیز گرد — کہ درمان ازویست زو نیز درد

ازو زار گردی ازو سرفراز — وزو دان فزونی وہم زو نیاز

بقول ان کے ان اشعار سے پایا جاتا ہے کہ وہ فلسفی ہے اس لئے کہ اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس گنبد تیز گرد سے ہوتا ہے۔ اور یہی فلسفیوں کا مذہب ہے۔ حالانکہ اسلام اس عقیدہ سے ہزاروں کوس دور ہے بلکہ وہاں یہ اصول ہے کہ ہر شے پر اللہ قادر ہے جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی قدرت سے ہوتا ہے ؛

جو کٹ ملا اس کے مخالف تھے سو وہ ان سادے اشعار میں سے اس کی فلسفیت کی دلیل دیتے تھے حالانکہ یہ محض لغو ہے۔ مشرقی شعرا نے ہمیشہ آسمان کی گردش کو اپنے اعمال اور نیکی بدی کی ڈیوٹی سونپ دی ہے جب وہ مفارقت کا مضمون باندھتے ہیں تو آسمان پر منہ آتے ہیں اور اپنے معشوق کی بیوفائی کا الزام بالکل آسمان اور اس کی گردش پر رکھتے ہیں کیونکہ ان کی حمیت اور محبت کے خلاف ہے کہ وہ بیوفائی کا الزام اپنے معشوق پر رکھیں۔ ایسی ایسی رکیک شاعرانہ تشبیہوں سے یہ ثابت کرنا کہ فردوسی فلسفیانہ مذہب رکھتا تھا سخت ناکارہ بات ہے ؛

جو لوگ اسے دہریہ اور لامذہب کہتے تھے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کرتے تھے جو پہلے اشعار سے بھی رکیک تر ہیں ؛

نہ گشت زمانہ بفرسایدش — نہ از رنج و تیمار بگزایدش

نہ از جنبش آرام گیرد ہمی — نہ چون ما تباہی پذیرد ہمی

بقول ان کے یہ اشعار آسمان کی قدامت اور لازوال ہونا ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ قیامت کے دن آسمان کے ٹکڑے اڑ جائینگے اور کوئی چیز ایسی نہ رہیگی کہ جس پر فنا کا برقع نہ پڑے۔ فردوسی کے مجنوں دشمنوں کے یہ اعتراض کیسے لغو اور

بے بنیاد ہیں کہ جن کا نہ سر نہ پیر۔ افسوس ہے کہ تعصب انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اور پھر اسے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ان اشعار میں فردوسی نے اپنی حسرت و یاس کا فوٹو کھینچا ہے اور نہایت افسوس سے کہتا ہے کہ ہم تو یوں تباہ ہوئے جاتے ہیں لیکن فلک جیسا تھا ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ستانے کا دل پر کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ان اشعار سے بھی ہم یہ سمجھ لیں کہ فردوسی دہریہ تھا تو ہماری سخت حماقت ہے اگر ایسی ہی باتوں سے دہریہ پن ظاہر ہوتا ہے تو دنیا میں شاید ہی کوئی مسلمان ملے +

ان لوگوں کے علاوہ جو لوگ اس پر رفض کا الزام قایم کرتے تھے وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کرتے ہیں +

اگر چشم داری بدیگر سرائے　　　بنزد نبی و ولی گیر جائے
گرت زین بد آید گناہ منست　　　چنیں است ایں رسم و راہ منست

یہ تماشا کی بات ہے کہ ایک ہی شخص فلسفی ہوا اور وہ ہی دہریہ ہوا اور وہی رافضی ہوا۔ اول تو یہ ہی امر محال ہے۔ جب یہ امر محال ہوا تو پھر وہ ان میں سے ایک بھی نہ ہوا اور آخر سنی المذہب اُسے ماننا پڑیگا۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جو نبی و ولی کا لفظ ہے اس سے انحصار نہیں پایا جاتا عموماً ہم کسی شے خاص کی دو ایک صفتیں بیان کر کے کل صفتوں کا انحصار اس پر کر دیتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے "المومن لا یکذب" مومن جھوٹ نہیں بولتا۔ یہاں مومنیت کا انحصار صرف جھوٹ نہ بولنے پر ہوتا ہے حالانکہ مومن کی اور بھی لازمی صفتیں ہیں جو اس میں ضرور ہونی چاہئیں۔ اگر وہ صرف سچ بولتا ہے اور کوئی صفت اسلام کی اس میں نہیں ہے وہ کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری جگہ یہ آیا ہے کہ جو اپنے ہمسایہ سے محبت رکھتا ہے جنت میں جائیگا۔ کیا اس کے صرف ہم یہی معنے سمجھ لیں۔ کہ جنت میں جانے کے لئے صرف ہمسایہ سے محبت کرنا کافی ہے۔ تو ہماری یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر کافر غیر اسلام بھی اپنے ہمسایہ سے محبت کیا کرتے ہیں کیا وہ جنت میں چلے جائینگے +

ان اشعار پر کیا مقرر تھا اس کے معمولی شعروں سے بھی نئے نئے الزامات کی باتیں پیدا ہونے لگیں اور چاروں طرف کھچڑی پکنی شروع ہو گئی۔ نوبت بانیجا رسید کہ محمود تک ان رکیک اعتراضوں کی آوازیں جلد پہنچیں۔ محمود روز مرہ نئی نئی باتیں فردوسی کے عقاید کی نسبت سنتا تھا مگر اسے ذرا بھی پروانہ تھی اور اس کی توجہ کچھ کبھی اس کی طرف مبذول نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک قدردان اور روشن دل حکمران تھا۔ بلکہ ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ اس نے سر دربار برملا یہ کہدیا "میں فردوسی کو اس کی لیاقت کی وجہ سے چاہتا ہوں مجھے اس کے مذہب سے کوئی بحث نہیں ہے میں نے اسے تلقین اسلام کے لئے نہیں رکھا ہے"

محمود کے اس جواب سے سب کے چھکے چھوٹ گئے اور فاضل شاعر کے دشمنوں نے آخر مونہ کی کھائی۔ اور وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے اور اپنی ناروا کوششوں میں سخت ناکام رہے۔ اس موقعہ پر سر جارج ہملٹن نے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں محمود جیسے حکمران کے لئے یہ مستبعد تھا کہ مولویوں کی اس بیجا کاوش کی فطرت کو نہ سمجھ سکتا اور اُن کے کہنے پر اپنے فاضل شاعر کو علیحدہ کر دیتا گو وہ ایک قہار فاتح اور جری حکمران تھا لیکن ان کُل صفتوں کا ظہور زیادہ میدان جنگ میں ہونا پسند کرتا تھا دربار میں علما اور فاضل شعراء کے لئے وہ منکسر مزاج شریف الطبیعت اور قدردان تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ لائق شخصوں کا ہر حالت میں ناز بردار تھا وہ مذہب کی طرف سے نہایت سخت مزاج تھا لیکن اس کی یہ سخت مزاجی محض ہم پلہ حکمرانوں کے مقابل میں ہوتی تھی نہ کہ اپنے ملازمین کے لئے۔ وہ اپنے لاثانی فضلا کا کشادہ دلی سے دوست تھا اور اُسے اُن کے مذہب سے کوئی تعرض نہ تھا۔ محمود کے ہاں بہت سے نصرانی بھی اعلیٰ اعلیٰ درجوں پر ممتاز تھے جن میں سب سے بڑا اسٹرسی مین تھا جو آسمانی کہلاتا تھا۔ یہ در اصل اطالیہ کا باشندہ تھا اور فیل خانہ کا داروغہ تھا۔ اس کے مرنے پر محمود نے بہت افسوس کیا۔ اس کے بال بچوں کو بہت کچھ دیکر بحفاظت اس کے ملک میں پہنچوا دیا جس کی ایسی

انخت رام

صاف اور قدر دان رحیم طبیعت ہو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا کہ وہ ان مذہبی اعتراضات کی کچھ پروا کرتا جو نیک خواہی کی آڑ میں محمود کے آگے فردوسی پر کئے جاتے تھے۔

سر جارج ہملٹن کی محمود کے کیریکٹر کی نسبت یہ منصفانہ رائے واقعی بہت قدر کے قابل ہے۔ میں بھی اس کی ہسٹوریکل فیکٹس کے مطابق اس کی تائید کرتا ہوں اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر فردوسی کی طرف سے اور زیادہ بے اعتدالیاں ہوتیں۔ تو کبھی فردوسی کو اپنی زندگی کا غیر خوش آیندہ زمانہ نہ دیکھنا پڑتا۔ فاضل شاعر کی بیجا بے پروائی جب فردوسی کے کان میں یہ آواز پہنچی کہ سلطان اس کی طرف ہے اور اس نے چغلی خوردن کو جھڑک دیا ہے تو اب اور بھی اس نے بے پرواہی اور بے اعتدالی اور غلط فہمی سے قدم آگے بڑھایا۔ اور اب وہ کھلم کھلا وہ ناروا حرکتیں کرنے لگا جو محمود جیسے غیور کے لئے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئیں۔

سلطان محمود نے حکم دیدیا تھا کہ بیس ہزار اشعار کے بعد بیس ہزار اشرفیاں فردوسی کو ملجایا کریں۔ لیکن عظیم کی روایت کے بموجب محمود نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ایک ہزار پر ایک ہزار اشرفی خزانہ سے حسن میمندی کی معرفت دیدی جایا کریں۔ مگر فردوسی نے ٹکڑے ٹکڑے لینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس نے یہ درخواست کی تھی کہ میں اکٹھی لے لونگا کیونکہ اسے شاداب اپنے مولد کی نہر بنوانی تھی جس کا اس نے محض ناداری کی حالت میں ارادہ کیا تھا۔

فردوسی کو سردست روپیہ لینے کی کچھ پروا بھی نہ تھی اس لئے کہ ہزار ہا روپیہ کے تحفے تحائف امراء اور وزراء کے پاس سے چلے آتے تھے۔ اسی اثنا میں کسی نے رستم و اسفندیار کا منظومہ واقعہ فخر الدولہ دیلمی کو لیجا کر دیا اس نے لیجانے والے کو بھی انعام دیا اور فردوسی کو بھی ہزار دینار بھیجے۔ فردوسی نے بخوشی غیر حکمران کا انعام محمود کو مطلع کئے بغیر قبول کر لیا۔ یہیں سے گویا فردوسی کی بدنصیبی کی تاریخ شروع ہوئی۔ یہ عجب پیچ آ گرا تھا کہ محمود کی اور فخر الدولہ کی باہم سخت عداوت تھی۔ فخر الدولہ کو لوگ معتزلی مشہور کرتے تھے اور محمود ایسے حکمران سے نفرت کرتا تھا۔ دوسرے یہ بھی سخت

نامناسب بات تھی کہ بغیر سلطانی حکم کے فردوسی مختلف منظومہ واقعات کو جگہ بجگہ روانہ کر رہا ہے اور وہاں سے اس کے لیئے انعام آ رہا ہے۔ یہ واقعی نہایت بے عنوانی فردوسی سے ہوئی اور یہی بہت بڑی وجہہ تھی کہ جس سے سلطان فردوسی سے ناراض ہوگیا۔ جونہی لوگوں نے سلطان کو فردوسی کی طرف سے کشیدہ خاطر دیکھا اب ان کا موقع بنا اور انہوں نے فردوسی کی طرف سے نئی نئی باتیں لگانی شروع کیں۔ ایسی حالت میں جو کچھ فردوسی کی نسبت کہا گیا وہ محمود کو یقین آگیا اور سنا گیا ہے کہ دن بدن محمود برافروختہ ہوتا جاتا تھا اور اس کی برافروختگی حقیقت میں بے بنیاد نہ تھی۔ محمود نے جیسا سر جارج ہملٹن نے لکھا ہے۔ فی شعر ایک اشرفی مقرر کرنا یہ تو ایک معمولی صلہ اور بہانہ تھا لیکن اس کے علاوہ جو غیر معمولی صلے بعد ازاں فاضل شاعر پر بخشے جاتے ان کا حساب پہلے ہی سے کر رکھا تھا اور کئی اپنی سواری کے عربی گھوڑے دو ہاتھی معہ ساز و ساماں کے شاعر کے دینے کے لئے پہلے ہی سے نامزد کر رکھے تھے۔ لیکن بدقسمتی اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اور اس نے فاضل شاعر کو آخر کار ذلیل و خوار کیا۔

عظیم سمرقندی نے اس معاملہ میں فردوسی کی بابت اچھا ریمارک پاس کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "فردوسی کا اپنی بیش بہا نظم کا محمود سے چھپا کر فخرالدولہ دیلمی کو بطور نذرانہ کے بھیجنا اور اس سے صلہ کی امید کرنی پوشیدہ گویا محمود کی چیرہ جلال شانی اور لاثانی قدر دانی پر ایک سخت حملہ تھا۔ اور ضرور تھا کہ قہار سلطان کا غضب انگیز طیش فردوسی کی جان پر ٹوٹ پڑتا اور اس کو بالکل پامال کر دیتا مگر اس بہر جاہ و عظمت اور کوہ تحمل و بردباری نے اپنے کو ضبط کیا اور اس خیال کو اپنے دل سے بالکل مٹا دیا۔ لیکن یہ خیال اپنے ہجو لی واقعہ سے پھر تازہ ہوگیا اور اب اس میں برابر ترقی ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ محمود پورا برافروختہ ہوگیا۔ اور یہ خبر دربار سے سارے شہر میں مشتہر ہوگئی کہ محمود فردوسی سے ناراض ہوگیا ہے۔ ایک دن دربار میں فردوسی کی برائیاں بیان ہو رہی تھیں اسی اثنا میں ایک شخص نے یہ کہا "فردوسی کے عقاید کی نسبت جو کچھ رائے زنی اب تک کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے نہ وہ دہریہ ہے نہ

فلسفی ہے نہ رافضی ہے بلکہ وہ آتش پرست ہے اور اپنے بزرگوں کا عقیدہ چھوڑا نہیں ہے۔ پھر اس شخص سے ثبوت دریافت کیا گیا تو اس نے یہ کہا۔ فردوسی کا قاعدہ ہے کہ جہاں یہ آتش پرستوں کا ذکر کرتا ہے تو ان پرزور اور فخریہ اشعار میں ڈھونڈا +

(شاہ کیخسرو کہتا ہے)

جہاندار پور سیاوش منم ۔۔۔ ز تخم کیاں شاہ روئیں تنم

نبیرہ جہاندار کاؤس کے ۔۔۔ دل افروز و پر دانش و نیک پے

زمادر ہم از تخم افراسیاب ۔۔۔ کہ با خشم او کم شدے خورد و خواب

نبیرہ فریدوں و پور پشنگ ۔۔۔ کہ بر پیل و شیراں جہاں کردہ تنگ

اس کے علاوہ اور بہت سی جگہ شاہنامہ میں کسی نہ کسی پہلوان کی زبانی اپنی گزشتہ قوم کی تعریف کروا دیتا ہے جیسے کہ اسجگہ اسفندیار کی زبانی کہتا ہے :-

نژاد من از تخم گشتاسپ است ۔۔۔ کہ گشتاسپ خود پور لہراسپ است

کہ لہراسپ بد پور آں زند شاہ ۔۔۔ کہ اورا بدے آں زماں تاج و گاہ

بداد ر نداز گوہر کے پشین ۔۔۔ کہ کردی پشین بہ پسر آفریں

پشین بود ان تخمہ کیقباد ۔۔۔ ہنرمند شاہے دلش پرز داد

ہمیدوں برو تا فریدوں شاہ ۔۔۔ کہ اصل کیاں بود و زیبائے گاہ

یہ تو اپنے بزرگوں کی صفات فخریہ اشعار میں بیان کی ہیں لیکن جب مسلمان عربوں کا ذکر آیا اس حالت میں کہ جب سعد بن وقاص نے قادسیہ کے میدان میں صف بندی کی اور یزدجرد شاہ ایران کو نامہ بھیجا تو اس آتش پرست شہنشاہ کی زبانی مسلمان عربوں بلکہ صحابہ نبی اکرام صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ جلے بھنے اشعار کہتا ہے :-

زشیر شتر خوردن و سوسمار ۔۔۔ عرب را بجائے رسید است کار

کہ تاج کیاں را کنند آرزو ۔۔۔ تفو باد بر چرخ گرداں تفو

حضور خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ مسلمان کی قلم سے یہ درشت اور نا ملائم الفاظ کبھی

نہیں نکل سکتے۔ پے در پے کے ان جملوں نے محمود پر اچھا اثر نہ کیا اور وہ فردوسی سے کشیدہ خاطر ہو گیا۔ مگر مرحبا اس قدردان سلطان کی متحمل طبیعت پر کہ اس نے پھر بھی اپنے طیش کو کھلم کھلا کام میں لانا نہ چاہا اور اس کی مروت نے یہ تقاضا نہیں کیا کہ وہ منہ بمنہ فردوسی سے کچھ کہتا۔

علاوہ اور حملوں کے جو اس کے عقائد کی نسبت کئے جاتے تھے اس کی نظم پر بھی نکتہ چینی ہونے لگی اور عین دربار میں اس کی برائیاں نکلنے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ فردوسی کی نظم میں حشو بہت ہوتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ مبالغہ زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی کسی محاورہ پر اعتراض کرتا تھا اور کوئی فصاحت و بلاغت پر۔ کہیں سے دربار میں یہ آواز آتی تھی "در سخن او نکتہ و لطیفہ نیست" اس پر سلطان محمود نے یہ کہا "تمام عیب ہی فردوسی کی شاعری میں ہیں یا کچھ ہنر بھی ہیں" سلطان کا اشارہ پاتے ہی جو لوگ فردوسی کے معتقدوں میں سے تھے وہ یہ کہنے لگے "قیمت نظم از سخن آرائی فردوسی است" پھر ان دونوں متضاد گروہ کی چھڑنے لگی۔ کچھ فردوسی کے موافق بول رہے تھے اور کچھ فردوسی کے خلاف لیکن بحث بڑے مزہ کی تھی۔ جب بڑی دیر تک سر پھٹول (زبانی) ہوتی رہی تو سلطان نے موافقین سے کہا۔ کہ فردوسی کی کوئی تازہ تصنیف پڑھو ابھی معلوم ہو جائیگا کہ فردوسی کا کیا پایہ ہے اور آج ہی اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے (دربار کی طرف مخاطب ہو کر) میں فردوسی کے مخالفوں کو اجازت دیتا ہوں کہ چاہے جس آزادی سے وہ اعتراض کریں تاکہ بعد ازاں اُنہیں اطمینان کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ ہمارا خیال غلط ہے یا صحیح۔ دونوں گروہ نے اس سے رضامندی ظاہر کی اور فوراً فیصلہ کرنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ کہیں سلطان کے حکم سے ان لوگوں میں سے ایک شخص نے جو فردوسی کے موافق تھے یہ اشعار پڑھے جو اپنا نظیر ہر صفت میں کہیں نہیں رکھتے۔

اشعار لکھنے سے پہلے دو چار جملوں میں یہ بھی بیان کر دینا چاہیئے کہ یہ حکایت کونسے مقام کی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ترکی افغانوں کی فوج میں کمانڈر انچیف کاموس

نے اشکبوس کو ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ ایرانیوں کی طرف سے اس سے
دو دو ہاتھ کرنے کے لئے رہام روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے جنگ کے بعد رہام بھاگ کر اپنے
حریف سے پہاڑ کی طرف جا چھپا۔ یہ دیکھکر ایرانی سپہ سالار طوس بہت آشفتہ ہوا اور
اسے سخت چشم زخم پہنچا اور عین میدان میں ایک خفت سی ہو گئی۔ اور اس نے اپنے
گھوڑے کو مہمیز کر کے چاہا کہ نفس نفیس اشکبوس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو۔ رستم
نے طوس سے کہا تو سپہ سالار ہے تجھے زیبا نہیں ہے کہ تو میدان جنگ میں جائے
تو اپنی سپاہ کو سنبھالے رکھ اور ان کی ہوشیاری سے کمان کر اور مجھے اس کے مقابلہ
کے لئے جانے دے۔ بس یہ حکایت ہے رستم گیا اور اس نے تیر سے اشکبوس کو
مار ڈالا۔ اس واقعہ کو فاضل شاعر اس طرح نظم کرتا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ فردوسی
سے بہتر اور کوئی اس موقع کو زبردست اور لاثانی نظم میں نظم نہیں کر سکتا ہے

وہ اشعار یہ ہیں

تو قلب سپہ را بآئین بدار
من اکنوں پیادہ کنم کارزار

یہ کہکر رستم پیادہ اشکبوس کی طرف جھپٹا اور تیر و کمان سے مستعد ہوا کیونکہ اس کا
ارادہ تیر ہی سے ہلاک کرنے کا تھا چنانچہ اس ارادہ کے مطابق رستم نے

بمالید چاچی کمانرا بدست   بچرم گوزن اندر آورد شست
ستون کرد چپ را خم کرد راست   خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد بہ پہنائے گوش   ز چرم گوزناں بر آمد خروش
چو بوسید پیکاں سر انگشت او   گذر کرد از مہرۂ پشت او
بزد تیر بر سینۂ اشکبوس   سپہر آں زماں دست او داد بوس
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد   تو گفتی کہ ہرگز ز مادر نزاد

سلطان محمود کو یہ ابیات ایسی بھلی معلوم ہوئیں کہ اس نے بار بار اپنی زبان سے پڑھ
و فردوسی کی بہت تعریف کی وہ کدورتیں جو فردوسی کی بے اعتدالیوں سے محمود کے

دل میں پڑ گئی تھیں بالکل جاتی رہیں اور اس نے تعریف کرتے کرتے اپنے انتہائی جوش مدح میں یہ فقرہ کہا "ہر چہ از کابلستان و زابلستان رستم میرسد - این چنین بیت بآن مے ارزد" ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اتنا بڑا حکمران اور وہ اس قدر شناسی سے تعریف کرے اس سے زیادہ قدردان کون ہو سکتا ہے - ادھر محمود کی فردوسی کی قابلیت پر یہ فریفتگی اور اُدھر فردوسی کی بے اعتدالی کیونکر ہمپلہ ہو سکتی *

عظیم سمرقندی اور سر جارج ہملٹن اور سی بی ایف آس یونانی مورخ نے فردوسی کے خواب کی نسبت لکھا ہے اور مختلف رائیں ہر شخص نے اس کے خواب پر دی ہیں لیکن میں فردوسی کے خواب پر کچھ رائے دینا نہیں چاہتا صرف اس کا جواب نقل کر دیتا ہوں تاکہ ہر شخص اس پر اپنی رائے قایم کرنے کے لئے آزاد ہے *

فردوسی نے جب رستم کی جرات اور دلیری - جہانگیری - قوت - ہمت کے ظاہر کرنے پر بہت زور لگایا اور اس کو حد تک پہنچا دیا اسی اثنا میں فردوسی نے رستم کو خواب میں دیکھا کہ دروازہ کمناباد سے پیادہ آ رہا ہے - خود فولادی سر پر ہے - زرہ بکتر پہنے ہوئے وہی چاچی ہیبت ناک کمان ہاتھ میں - غرض بالکل اسی صورت سے وہ اس کے سامنے آیا جو حالت جنگ اشکبوس میں رستم کی بیان کی تھی - چہرہ پر رعب اور خونخواری برس رہی ہے اور ایک عجیب مہیب صورت تھی کہ ایسی کبھی دیکھی نہ سنی - یہ دیکھتے ہی فردوسی اس کے پاس گیا سلام کیا - رستم نے نہایت لطف سے بخندہ پیشانی جواب دیا اور بہت نوازش کی - پھر ہنسا اور چند ہی منٹ کے بعد زار زار رونے لگا اور کہا کہ تیری خدمت کی حق گذاری چاہتا ہوں مگر میں محض بے دست و پا ہوں مجبوری میرا اوڑھنا بچھونا ہے حسرت و یاس و ناکامی میرے ندیم ہیں افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا اور اسی نہ کر سکنے پر روتا ہوں خیر پھر بھی جو کچھ میری قدرت میں ہے وہ میں تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں گر قبول افتد زہے عز و شرف (ہاتھ سے اشارہ کر کے) فلاں مقام پر میں نے ایک دشمن کو قتل کیا تھا جواہرات کا سامان اس کے پاس کثرت سے تھا چونکہ

اس وقت میں نے لے لینا مناسب نہ جانا اس لئے اس جگہ دفن کر دیا تھا۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو اس جگہ سے کھود کر نکال لیجو۔ یہ کہکر رستم نے اسی جا پر ایک تیر مارا اور کہا کہ وہ جگہ یہ ہے۔ اتنے میں فردوسی کی آنکھ کھل گئی *

فردوسی نے اس خواب کی فطرت پر غور کیا تو اسے صرف اپنے ہر لحظہ کے خیالات کا پرتو معلوم ہوا کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ رستم کو دو ڈھائی ہزار برس ہو چکے تھے۔ اتنی مدت میں ملک کا کیا سے کیا رنگ پلٹ گیا ہوگا صدہا گز مٹی چڑھ گئی ہوگی اور جہاں ٹیلے اور پہاڑیاں ہونگی وہ مسمار ہو کر زمین کی سطح کے برابر ہو گئی ہونگی۔ پھر کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ کہ وہاں رستم کا دبایا ہوا زر و جواہر اب تک موجود ہوگا۔ اس خیال نے فردوسی کے دماغ میں قوت پکڑی اور اب اسے یہ یقین ہوا کہ اگر میں نے اس خواب کا بیان کسی سے کیا تو لوگ کھینگے کہ فردوسی کو الیخولیا ہو گیا ہے۔ گو یہ محض خواب و خیال تھا پھر بھی فردوسی کے دل میں ایک کریدسی باقی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا اظہار پرائیوٹ طور پر کسی سے کردں سوچتے سوچتے فردوسی نے ایاز کو اس راز کے بوجھ کو اٹھانے کے موزون پایا۔ حقیقت میں یہ امر ہے کہ ایاز کو فردوسی سے دلی محبت تھی اور یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ وہ اسے اپنا باپ کہتا تھا اور جہاں تک اس سے ممکن ہوسکتا تھا فردوسی کی دربار میں سفارش کرتا تھا فردوسی نے خواب دیکھنے سے تیسرے دن ایاز کو پاس بلایا اور کہا کہ میں تجھ سے اپنا ایک خواب بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن التجا یہ ہے کہ تو کسی سے اس خواب کا اظہار نہ کرے ایاز نے نہایت استواری سے عہد کیا اور کہا تو خاطر جمع رکھ اس کی بھنک بھی کسی کے کان تک نہ پہنچے گی۔ یہ سن کر فردوسی نے جو کچھ گذرا تھا سارا حال بیان کر دیا ایاز ایک بہت بڑا اور تربیت یافتہ خادم محمود کا تھا۔ اس نے یہ خواب سن کر اپنے منہ بولے باپ فردوسی کی تردید نہ کی اور وہ فاضل شاعر کی صورت سے پہچان گیا کہ اس کے چہرہ پر بےچینی سی چھا رہی ہے اور ایک مذبذب سا پایا جاتا ہے۔ شاید یہ اس جگہ کو کھدوانا چاہتا ہے۔ یہ خیال کر کے اس نے فوراً اقرار کیا اور کہا کہ کیا عجب تیرا خواب

صحیح ہو۔ اپنا کیا ہرج ہے اس جگہ کو کھدوا ڈالینگے جو کچھ ہوگا آپ کھل جائیگا۔ یہ سنکر فردوسی کو اطمینان ہوا اور پریشان تذبذب نے اس کے دل و دماغ سے روگردانی کی۔ ایاز نے پھر یہ کہا کہ ابھی تو موقع نہیں ہے ہاں گرمیوں میں ٹھیک کارروائی ہوسکتی ہے۔ چونکہ سلطان موسم گرما میں بلندی پر چڑھ جاتے ہیں اور ان کا راستہ کنارہ رکنآباد سے ہوتا ہے اور ایک دن بندگان عالی قیام بھی یہاں کیا کرتے ہیں اس وقت میں اس جگہ کو کھدوا ڈالوں گا۔ باہم یہ سمجھوتا ہوگیا۔ اور موقع پر وہ جگہ کھدوائی گئی تو اس میں سے وہی چیزیں برآمد ہوئیں جن کی بشارت خواب میں رستم نے دی تھی۔ جونہی فردوسی نے ان چیزوں پر نظر کی اس قدر خوش ہوا کہ اگر لاکھوں روپیہ کوئی بخش دیتا تو اتنا خوش نہ ہوتا۔ بعدازاں ایاز نے محمود کے آگے فردوسی کے مشورہ سے وہ کل چیزیں فردوسی کو بخشدیں۔ فردوسی ایک اولوالعزم اور قانع شخص تھا۔ اس نے ایک پیسہ بھی اس میں سے نہیں لیا اور اس کی قیمت کا زر مسکوک شعرا کو تقسیم کردیا۔ اس خواب کی شہرت تمام زمانہ میں ہوئی۔ خواہ اسے اتفاق کہا جائے یا کچھ سمجھا جائے لیکن یہ واقعہ ہرگز غلط نہیں ہے۔ وہ مقام اب تک نہایت دلچسپی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مسٹر ہربرٹ نے اپنے سفر میں اس مقام کو دیکھا جہاں ایک عمارت پختہ بنی ہوئی ہے اور اس میں ایک پتھر چسپاں ہے جس پر خواجہ علی کی مفصلہ ذیل ابیات کندہ ہیں۔ خواجہ علی بھی محمود کے بڑے عہدہ داروں میں تھا اور اس نے فی الفور یہ ابیات موزون کرکے وہاں کندہ کرادئے ہیں +

قطعہ

اے روزگار از چہ سبب بے مروت اند | این سروراں دہر بدور زمان ما
رستم کہ در نبرد نگفتی کہ از شرف | بہرام بوسہ داد رکاب عنان ما
یک شب بخواب گفت بفردوسی عزیز | در بند حق گذار دل تست جان ما

آمادہ و نہادہ فلاں جا دفینہ ایست | از سعی گرز و خنجر گیتی ستان ما
بردار زانکہ دست رس ما دگر نماند | ہر چند شرمسار بود زال زدان ما
از مردگاں حکایت احسان چنیں کنند | بے التماس ما و حدبے اشکان ما
معلوم مے شود کہ دریں دور دول نواز | ایں زندگان کم اندازاں مردگان ما
سرگیں سالخوردہ آن خواجگاں مصر | بہتر ز ریش و سبلت ایں خواجگان ما

اس طرح فردوسی نے ساٹھ ہزار ابیات پینتیس برس کے عرصہ میں شاہ نامہ کو ختم کر دیا - اس پینتیس برس میں بڑی بڑی اکھیڑ پچھاڑ ہوئی رہی اور محمود کے دل پر کئی کئی بار فردوسی کی طرف سے نقش کدورت جمے اور مٹ مٹ گئے - غرض اس عرصہ میں دشمنوں نے بھی بہت بہت کچھ زور مارا لیکن فردوسی کا بال بانکا نہ ہوا - اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ محمود نے یوں ہی سی بھی فردوسی کو چشم نمائی کی ہو - وہ اس کی قدر بخوبی جانتا تھا اور اسے یہ معلوم تھا کہ ان بے اعتدالیوں سے جو فاضل شاعر سے پیش آئی ہیں ان درباری شکایتوں سے جو شب و روز کی جاتی ہیں اس کی لیاقت زیادہ قیمتی ہے - گو محمود کا دل اس سے صاف تھا مگر فردوسی درباریوں کے بہکانے سے کھٹک گیا تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ میری ٣٥ سالہ محنت کا مجھے صلہ نہ ملیگا - لوگوں کا قاعدہ تھا کہ محمود سے تو فردوسی کی شکایت کرتے تھے اور فردوسی سے محمود کی - ان کی یہ شکائتیں محمود کے آگے تو محض بے وقعت ثابت ہوئیں لیکن فردوسی کے دل پر ان کا نقش ہوتا گیا اور ہم افسوس سے دیکھتے ہیں کہ جس شوق سے اس نے شاہ نامہ لکھنا شروع کیا تھا اسی حسرت و ناکامی سے اس کے اختتام پر اسے اپنے دل کی حرمانی اور شکستگی ظاہر کرنی پڑی اور اپنی اس لاثانی تصنیف کو ان بجھے ہوئے اور رقت انگیز اشعار میں ختم کرتا ہے *

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج | فزوں گردم اندیشۂ درد و رنج
بتاریخ شاہاں نیاز آمدم | بہ پیش اختر دیر ساز آمدم

بزرگان و بادانش آزادگان ۔۔۔ نبشتند یکسر ہمہ رائیگاں

نشستہ نظارہ من از دورشاں ۔۔۔ تو گفتی بدم پیش مزدورشاں

جز احسنت از ایشاں نبدہ بہرام ۔۔۔ بگفت اندر احسنت شاں زہرام

ازاں نامور نامداران شہر ۔۔۔ علی و دلمی بود کو راست بہر

کہ ہموارہ کارم بخوبی رواں ۔۔۔ ہمی داشت آنمرد روشن رواں

حسین قطیب است ز آزادگاں ۔۔۔ کہ از من نخواہد سخن رائیگاں

از وہیم خورد و پوشش و سیم و زر ۔۔۔ ازو یافتم جنبش و پا و پر

نیم آگہ از اصل و فرع و خراج ۔۔۔ ہمے غلطم اندر میان دواج

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک ۔۔۔ ہمے زیر شعر اندر آمد فلک

سی و پنج سال از سرائے سپنج ۔۔۔ بسے رنج بردم بامید گنج

چو بر باد دادند رنج مرا ۔۔۔ نبد حاصلے سی و پنج مرا

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد ۔۔۔ امیدم بیک بار بر باد شد

سر آمد کنوں قصہ یزدگرد ۔۔۔ بماہ سفندارمذ روز ارد

ز ہجرت شدہ پنج و ہشتاد بار ۔۔۔ کہ گفتم من این نامہ شاہوار

تن شاہ محمود آباد باد ۔۔۔ سرش سبز بادا دلش شاد باد

چنانش ستودم کہ اندر جہاں ۔۔۔ سخن ماند از آشکار و نہاں

مرا از بزرگاں ستایش بود ۔۔۔ ستایش ورا و فزایش بود

کہ جاوید بادا خردمند مرد ۔۔۔ ہمیشہ بکام دلش کار گرد

بدو ماندم این نامہ را یادگار ۔۔۔ بہ شش ہیور ابیاتش آمد ہزار

زمانم سر آورد و گفت و شنید ۔۔۔ چو روز جوانی بہ پیری رسید

چو این نامور نامہ آمد بہ بن ۔۔۔ ز من روئے کشور شد پر سخن

ہر آنکس کہ دارد ہش و رائے و دیں ۔۔۔ پس از مرگ بر من کند آفریں

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام ۔۔۔ کہ تخم سخن را پراگندہ ام

غرض جب یہ شاہنامہ تکمیل ہوکر پیش ہوا تو محمود نے فوراً حسن میمندی کو حکم کیا کہ ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کو بھجوا دی جائیں اور جو کچھ اس کے علاوہ اس کے لئے انعامات تجویز ہوئے ہیں وہ عام دربار میں معہ خلعت عنایت ہونگے اور پھر سلطان محمود نے یہ کہا "از ابتدائے ظہور صناعت شعر تا اکنوں کسے بدیں طرز و اسلوب سخن خوب نگفتہ و ہیچ جوہر لالی کلام موزوں بدیں طرز نشنفتہ" اس کے بعد نہایت جوش میں محمود نے یہ اشعار فردوسی کی توصیف میں پڑھے +

که گوید چنیں نظم چوں دررواں ‏ ‏ که گوید چو فردوسی اندر جہاں
رسد صیت و نطقش بچرخ بلند ‏ ‏ کہ گفتہ است نظمے چنیں ارجمند
ز انفاس او بوے جاں مے دمد ‏ ‏ ز نزکیبش آب رواں مے چکد
دراں دم کہ تیغ زباں برکشید ‏ ‏ صف جملۂ شاعراں بردرید
بمیدان دانش چوں آں پہلتن ‏ ‏ ندیدیم نظم آور و تیغ زن
بہ پیشم چو بکشود گنج گہر ‏ ‏ کنوں پیلوارش دہم گنج زر

یہ سن کر خواجہ حسن میمندی خاموش ہو رہا اور اس نے اس کے جواب میں ایک حرف بھی نہ کہا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطانی حکم کی تعمیل کے لئے مستعد نہیں ہے۔ محمود کو اس کا یہ سکتہ ناگوار گذرا خفا ہوکر دریافت کیا کہ تو خاموش کیوں ہو رہا خواجہ نے بکمال انکساری یہ عرض کیا ہر چند پیلوارے زر در میزان احسان پادشاہ بپرشۂ نسنجد و شخص ہمت سلطان در قضائے پہنا ور گیہان نگنجد۔ اماں چوں بر رائے حکمت آرائے عالی مخفی نیست کہ شادی مفرط چوں غم بے اندازہ ہادم حیا تست اکنوں نعوذ باللہ کہ اگر ایں صلہ کہ پادشاہ مذکور فرمود برسد بلا شک مقتضی او ہلاک او خواہد شد +

چو بگذشت ز اندازہ شادی و غم ‏ ‏ رواں تو مند گرود و نژم
چو بنیاد عمرے بود اندیش شاہ ‏ ‏ کنند آں دو دو کن بقالیش تباہ

یعنے حضور کے آگے ساٹھ ہزار اشرفیاں کچھ مال نہیں ہیں مگر جس کو دیجاتی ہیں اس کے ظرف کے آگے بہت زیادہ ہیں ایسا نہو کہ فرط انبساط سے ایسا جید شاعر ہاتھ سے جاتا رہے۔ محمود نے خواجہ کو جواب دیا کہ تیرا یہ خیال محض بے بنیاد ہے۔ وہ بڑا حوصلہ مند ہے۔ اسے ساٹھ ہزار اشرفیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں اسے زر موعود نہ دوں ؛

خواجہ نے جب دیکھا کہ یہ افسوں بھی محمود پر نہ چلا تو وہ نہایت پرتاثر لہجہ میں گڑگڑا کر یہ کہنے لگا ؛

"اے سلطان عالم پناہ حیف باشد کہ روستائی شاعر را شصت ہزار مثقال طلا ربدہند اگر صلاح بندگاں باشد اور اشصت ہزار مثقال نقرہ کفایت است" یہ سن کر محمود کو یہ خیال ہوا مبادا خواجہ حسن کا کہنا صحیح نکلے مناسب ہے کہ پہلے اس کو ساٹھ ہزار روپیہ دوں بعد ازاں اس کا باقیماندہ زر موعود حوالہ کردوں۔ یہ سوچ کر محمود نے خواجہ کی رائے سے اتفاق کیا اور حکم دیا کہ ابھی ساٹھ ہزار روپیہ اس کو بھیج دیئے جائیں خواجہ نے خچروں پر تھیلیاں لدوا کر فردوسی کے پاس بھیجدیں اور ایاز کو ساتھ کر دیا۔ فردوسی حمام سے غسل کر کے نکلتا تھا کہ ایاز نے سلام کیا اور وہ روپیہ پیش کئے ؛

پہلے تو فردوسی بہت خوش ہوا کہ سلطان نے زر موعود بھجوا دیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس میں ترمیم ہوئی ہے۔ اس نے نہایت افسوس سے ٹھنڈا سانس بھر کر ایاز سے یہ فقرہ کہا "سلطان نہ چنیں فرمودہ بود" ایاز نے کہا "اصل میں سلطان کا قصور نہیں ہے یہ خواجہ حسن میمندی کی بد معاشی ہے" جو کچھ اس نے سلطان سے گفتگو کی تھی سب بیان کر دی۔ جب فردوسی سن چکا اس نے بیس ہزار ایاز کو مرحمت کئے۔ شربت فروش سے بیس ہزار روپیہ کی قیمت میں ایک پیالہ شربت کا لیکر پیا اور نہایت غمگین مگر برافروختہ لہجہ میں یہ الفاظ زبان سے ایاز کو مخاطب کر کے نکالے ؛

"بعرض سلطان رسانند تا بداند کہ این نامور رنجنیکہ دریں کار کشیدم نہ از بہر درم و دینار بود فکیف آں مہر در آں ہنگام کہ چراغ ضمیر باتش فکرت افروختہ ام اصغاف و آلاف آں شمع تعبنیر سوختہ بلکہ بناے آں بر تخلص بند ذکر و ناموس نہادہ و ابواب ثنائے جمیل بر چہرہ احوال خود کشودہ است"۔

ایاز نے اپنے باپ کی جب یہ ٹوٹی ہوئی تقریر سُنی وہ بہت افسردہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کئی منٹ تک دست لبستہ حالت سکوت میں کھڑا رہا اس پر فردوسی نے کہا اے پیارے ایاز تو اس کا کچھ غم نہ کھا اور جو کچھ میں نے کہا ہے باین الفاظ سلطان سے جا کر کہدے اور اپنے دل میں کسی قسم کا ہراس نہ کر۔ ناچار ایاز نے لفظ بلفظ سلطان سے جا کر عرض کر دیا۔ یہ سنکر سلطان ایسا خفیف ہوا کہ جس کا بیان نہیں اور اُسے حسن میمندی پر اتنا غصہ آیا کہ اس کی ہڈیاں چبا جائے۔ اپنی اسی پر غیظ حالت میں حسن میمندی کو بلوایا اور یہ گرم گرم الفاظ زبان پر لایا "اے ضعیف النفس بواسطہ این حرکات عرض مارا عرضۂ توبیخ و تشریب شعرا ساختی و بانواع نکوہش و ندام در زبان آں طائفہ انداختی" محمود کی رنگت مارے غضب کے تمتما رہی تھی اور وہ خفت کے مارے عرق عرق ہوا جاتا تھا۔ حسن میمندی ایک چلتا ہوا شخص تھا موقع پر بات بنا دینا یہ اس کے بائیں ہاتھ کا داؤں تھا۔ اس نے محمود کے اس غصہ کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ نہ کچھ ہراس دل میں لایا۔ بلکہ نہایت متانت اور سنجیدگی سے یہ جواب دیا "صلہ پادشاہ از یک درم تا صد درم مساویست اگر مشت خاک از حضرت سلطان بدو فرستادندے بایستے کہ از روئے اعزاز و اکرام آنرا بجاے توتیا در باصرہ کشیدے و بساط رفاعت و حماقت بسر پنجہ ادب و کیاست در نوردیدے۔ چنانچہ استاد گفتہ است"

عطا گرچہ اندک دہد پادشاہ   بہ بسیاریش کرد باید نگاہ

کہ ہر کس کہ منظور شاہی بود — سزاوار دیہیم و گاہی بود
گرت سیل باید ز قطرہ شنو — تو این نکتہ از عین حکمت شنو
زباں را بود قطرہ از ابتدا — ولیکن شود سیل در انتہا"

جب میمندی نے نہایت سنجیدگی سے یہ گفتگو کی تو سلطان پر اس کی اس تقریر نے جادو کا کام کیا۔ سلطان فردوسی سے کالے ناگ کی طرح پلٹ گیا اور اب اسے خیال آنے لگا کہ فردوسی نے میری توہین کی ہے فردوسی کی گذشتہ بے اعتدالیاں سب یاد آگئیں اور اب ان کے نقوش لوح دل پر ابھر آئے۔ سلطان کو یقین ہو گیا کہ فردوسی سخت مغرور اور گستاخ ہے اس خیال نے لمحہ بلمحہ محمود کے دماغ میں ترقی کی اور آخر نہایت غضب انگیز حالت میں اس کی زبان سے یہ نکل گیا "آں قرمطی را بامداد در پاے پیل اندازم و عقوبت او را عبرت سائر بے ادباں سازم"۔

ایاز نے یہ خبر فوراً فردوسی کو پہنچائی کہ کل یہ غضب ہونے والا ہے۔ یہ سنتے ہی فردوسی کے ہوش اڑ گئے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ سناٹے میں دیک رہگیا کہ اب کیا کروں ایاز نے اسے تسلی دی اور کہا جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہیگا زیادہ غم کرنے سے تدبیر میں بھی ضعف آجاتا ہے۔ جہاں تک ہو کوئی تدبیر کرنی چاہیئے شاید کوئی صورت بچاؤ کی نکل آوے۔ فردوسی نے روکھی آواز میں جواب دیا کہ میری آنکھوں کے سامنے تو موت گردش کھا رہی ہے۔ مجھے تو سولے موت کے اور کچھ دکھائی دیتا نہیں۔ اگر تجھے کوئی تدبیر معلوم ہو تو بتا دے ایاز نے کہا کہ سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ علی الصباح سلطان محمود کے پیروں پر گر پڑ اور گڑگڑا کر اپنے قصور کی معافی چاہ۔ یہ ناممکن ہے کہ تیرا گناہ نہ بخشا جاوے۔ اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ دوسرے دن فردوسی نے یہی کیا سلطان نماز فجر پڑھ کر باغ کی روشوں پر ٹہل رہا تھا۔

فردوسی اپنی جائے قیام سے نکل جو اس کی سیرگاہ کے قریب تھی محمود کے قدموں پر گر پڑا اور یہ کہا۔

حاسدان در حضرت پادشاہ چناں نمودہ اند کہ بندہ از قرامطہ در واقضہ است حقا کہ خلاف نمودہ اند و بے ادبی کہ عطیہ سلطان لشنتدم بعنایت سلطان بازبستہ است و بر تقدیر ہر مذہب کہ گویند چوں در ممالک سلطان از ہر طائف گیرو جہود و ترسا ہستند و جزیہ و بدلیاں پادشاہ میدہند ایں بندہ را یکے ازاں طوائف شمارند و خطاب قتل دارہاف روح از جان ناتواں بر دارند۔

چو در ملک سلطاں کہ چرخش ستور	بسے ہست ترسا و گبر و یہود
کہ ایشاں بجزیہ کفایت کنند	زر و مال و خوں شاں حمایت کنند
گرفتند در ظل عدلش قرار	شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطاں گرو دل شکوہ	مرا ہم شمار د یکے از گروہ

محمود کے غصہ پر پھر اس کی قدردانی کے خیال نے غلبہ کیا اور تمام جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ محمود نے اٹھا کر فردوسی کو اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ جو سختی تیرے ساتھ ہوئی ہے اس کی میں معافی چاہتا ہوں اور جو بے ادبی تو نے میری کی ہے اسے معاف کرتا ہوں۔ فردوسی نے جب یہ شفقت آمیز فقرے سنے تو بہت ہی ممنون ہوا اور اب اپنی زندگی کا خوف مطلق جاتا رہا۔

ببوسید فردوسی آنگہ زمیں	بمالید بر خاک راہش جبیں
بدوں رفت انگاہ درگاہ شاہ	دلے کرد ازاں خطہ آہنگ راہ

سلطان نے بجندہ پیشانی فردوسی کو اطمینان دیکر رخصت کیا۔ فردوسی اپنی قیامگاہ پر آیا اور دل میں کہنے لگا کہ یہاں کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اگر میں اب کی بچ گیا تو کیا۔ دوبارہ بچنا مشکل ہے۔

دشمن لگے ہوئے ہیں ضرور ہلاک کر کے چھوڑینگے - اس لئے یہ موقع بھاگنے کا بہت مناسب دیکھا اور مصمم ارادہ کرلیا کہ غزنی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہے - گو محمود نے اس قدر اطمینان دلادیا تھا پھر بھی شاعر کے غصہ کی آگ سرد نہ پڑی تھی - وہ محمود کی اس بیقدری پر دانت پیستا تھا - حالانکہ محمود پر جو الزام فردوسی لگاتا تھا اس کی ذات ان الزامات سے بالکل بری تھی - خیر کچھ ہو فاضل شاعر کو محمود سے دلی نفرت ہوگئی تھی - اور اب وہ اس کے دروازہ پر پانی پینا بھی نہ چاہتا تھا - اسی کشمکش میں مکان پر آیا اور غلط فہمی سے سخت غصہ کی حالت میں گنتی ہزار ابیات جو اس نے بیاض میں شامل نہ کی تھیں جھر جھر چاک کر کے ان میں آگ لگادی ؛

زلال رواں بخش ایں نظم پاک درآتش فگند و نیاورد باک
اگرچہ شود کشتہ آتش ز آب ولیکن شدہ آب ز آتش خراب

سوائے ایاز کے اور کوئی بھی فردوسی کا راز دار نہ تھا فردوسی نے شفقت پدری سے یہ بعید جانا کہ ایاز کو بھی بے اطلاع یہاں سے چلدے چنانچہ اس نے اسیوقت ایاز کو بلا کر یہ کہا - یہ موقع میرے لئے بہتر ہے کہ میں اپنی جان بچا کر چلدونگا - گو سلطان نے میرا قصور اب معاف کر دیا ہے لیکن یہ معافی دیرپا اور قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی - اب تو میں اپنی جان بچا کر چلدونگا اور اگر یہاں سے نہ گیا تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اپنی جان ہلاکت سے بچا سکوں - فردوسی کا یہ ارادہ سن کر ایاز رونے لگا - مگر وہ بیچارہ کیا کرسکتا تھا آخر اُسے بھی فردوسی کے ارادہ کی تائید کرنی پڑی - فردوسی نے جب ایاز کو راضی دیکھا تو یہ کہا کہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں ہے کہ رستہ میں کچھ کام آوے اگر تو کچھ مدد کرے تو میں تیرا بہت ممنون ہونگا - ایاز نے کچھ جواہرات قیمتی اور زرنقد فاضل کو دیا اور ایک عربی گھوڑا شہر سے باہر کسی پوشیدہ جگہ میں کھڑا کردیا شب کو فردوسی بھیس بدلکر شہر سے نکل بھاگا اور پھر اس گھوڑے پر سوار ہوکر

جو اس کی بڑی دیر سے انتظاری کر رہا تھا چلتا بنا۔ہاں چلتے وقت ایک بند لفافہ ایاز کو دیگیا اور یہ کہدیا کہ میرے جانیکے بیس دن بعد یہ لفافہ سلطان کی خدمت میں پیش کردیجو۔غزنی کی بڑی مسجد میں جاتے وقت بیتیں دیوار پر لکھ گیا جو مفصلہ ذیل ہیں +

خجستہ درگہ محمود روانی دریاست	چگونہ دریا کانرا کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہا زدم واندراں ندیدم در	گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

سربستہ لفافہ کا مضمون فردوسی کا سفر اور وفات

ایاز گو ایک غلام تھا لیکن شائستہ اور مہذب اس بلا کا تھا کہ بڑے بڑے امرا اور علما کے بچے اس سے سبق پڑھتے تھے۔وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا اور نہ کبھی خلاف وعدہ کرتا تھا۔جو کچھ اس نے وعدہ کرلیا اگر جان بھی جاتی رہنے کا خوف ہو لیکن اس سے روگردانی نہ کرتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ محمود کا بہت پیارا تھا اور محمود اپنے سب غلاموں سے زیادہ اسی کو عزیز رکھتا تھا۔چونکہ اس نے فردوسی سے سربستہ لفافہ لیکر وعدہ کرلیا تھا کہ بیس[۲۰] دن کے بعد سلطان کی خدمت میں پیش کرونگا اس لئے اُسے فرض ہوا کہ وہ اکیسویں[۲۱] دن ضرور سربستہ لفافہ سلطان کی خدمت میں پیش کرے۔گو ایاز کو شبہہ تو ہوا تھا اور اس نے فردوسی کے چلنے کے بعد یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ لفافہ کو کھولکر دیکھوں لیکن اس نے ایمانداری اور کریمی کے خلاف جانا اس کا غالب یقین یہ تھا کہ ضرور اس سربستہ لفافہ میں کچھ حسن میمندی کی شکایت لکھی ہوگی۔اور اپنی بے قصوری کا بیان ہوگا۔اس کے سوا اور ایاز کے دل میں کوئی خطرہ

گذرا تھا۔ اپنی اپنی بیخبری کی حالت میں اس نے اکیسویں دن فرصت کے وقت وہ سربستہ لفافہ محمود کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود نے اس لفافے کو کھولکر دیکھا تو یہ لکھا تھا؛

ایا شاہ محمود کشورکشائے — زکس گرنہ ترسی بترس از خدا

کہ پیش از تو شاہاں فراواں بدند — ہمہ تاجداران گیہاں بدند

فزوں از تو بودند یکسر بجاہ — بہ گنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

نکردند جز خوبی و راستی — نگشتند سوئے کم و کاستی

ہمہ داد کردند بر زیر دست — نبودند جز پاک یزداں پرست

نجستند از دہر جز نام نیک — وزاں نام جستن سر انجام نیک

ہر آں شہ کہ در بند دینار بود — بنزدیک اہل خرد خوار بود

گر ایدوں کہ شاہی نکیتی ترا است — بگوئی کہ ایں خیرہ گفتن چرا است

ندیدی تو ایں خاطر تیز من — نیندیشی از تیغ خوں ریز من

کہ بد دین و بدکیش خوانی مرا — منم شیر نرمیش دانی مرا

مرا غمزہ کردند کاں بد سخن — بمہر نبی و علی شد کہن

ہر آنکس کہ در دلش کیں علیست — ازو در جہان خوار تر گو کہ کیست

منم بندۂ ہر دو تا رستخیز — اگر شہ کند پیکرم ریز ریز

من از مہر ایں ہر دو شہ نگزرم — اگر تیغ شہ بگزرد بر سرم

مرا سہم دادی کہ در پائے پیل — تنت را بسایم چو دریائے نیل

نہ ترسم کہ دارم ز روشن دلی — بدل مہر جان نبی و علی

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی — خداوند امر و خداوند نہی

کہ من شہر علمم علیم درست — درست ایں سخن قول پیغمبر است

گواہی دہم کیں سخن راز اوست — تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست

چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے — بنزد نبی و علی گیر جائے

گرت زیں بد آید گناہ منست ــ چنیں است ایں رسم و راہ منست

بایں زادہ ام ہم بایں بگذرم ــ چناں داں کہ خاک پے حیدرم

اگر شاہ محمود زیں بگذرد ــ مر او را بیکجو نسنجد خرد

چو بر تخت شاہی نشاند خدائے ــ نبی و علی را بدیگر سرائے

گر از مہرشاں من حکایت کنم ــ چو محمود را صد حمایت کنم

جہاں تا بود شہریاراں بود ــ پیامم بر تاجداراں بود

کہ فردوسی طوسی پاک جفت ــ وایں نامہ بر نام محمود گفت

بنام نبی و علی گفتہ ام ــ گہرہائے معنی بسے سفتہ ام

چو فردوسی اندر زمانہ نبود ــ بداں بد کہ بخشش جوانا نبود

نکردی دریں نامۂ من نگاہ ــ بگفتار بدگوئے گشتی ز راہ

ہر آنکس کہ شعر مرا کرد پست ــ نگیردش گردوں گردندہ دست

من ایں نامۂ شہریاران پیش ــ بگفتم بدیں نغز گفتار خویش

چو عمرم بنزدیک ہشتاد شد ــ امیدم بیکبارہ برباد شد

بسے سال اندر سرائے سپنج ــ چنیں رنج بردم بامید گنج

ز ابیات غرا دو رہ سی ہزار ــ مراں جملہ در شیوۂ کارزار

ز شمشیر و تیر و کماں و کمند ــ ز گوپال و از تیغ ہائے بلند

ز برگستواں و ز خفتان و خود ــ ز صحرا و دریا و از خشک و رود

ز گرگ و ز شیر و ز پیل و پلنگ ــ ز عفریت و از اژدہائے نہنگ

ز نیرنگ غول و ز جادوے دیو ــ کز ایشاں بگردوں رسیدہ غریو

ز مرداں نامی بروز مصاف ــ ز گرداں جنگی گہ رزم لاف

ہمہ نامداران با جاہ و آب ــ چو تور و چو سلم و چو افراسیاب

چو شاہ آفریدوں و چوں کیقباد ــ چو ضحاک بدکیش و بے دین و داد

چو گستاشپ و سام نریماں گرد ــ جہاں پہلواناں با دست و برد

چو ہوشنگ و تہمورث دیو بند | منوچہر و جمشید شاہ بلند

چو کاؤس و کیخسرو تاجور | چو رستم چو روئین تن نامور

چو گودرز و ہشتاد پور گزین | سواران میدان و شیران کین

ہمان نامور شاہ لہراسپ را | وزیر سپہ دار گشتاسپ را

چو جاماسپ کاندر شمار سپہر | فروزندہ تر بد ز تابندہ مہر

چو داراے داراب و بہمن ہمان | سکندر کہ بد شاہ شاہنشہان

چو شاہ اردشیر و چو شاپور او | چو بہرام و نوشیروان نکو

چو پرویز و ہرمز چو پورش قباد | چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد

چنین نامداران گردن کشان | کہ دادم یکایک از ایشان نشان

ہمہ مردہ از روزگار دراز | شد از گفت من نام شان زندہ باز

چو عیسے من این مردگان را تمام | سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

یکے بندگی کردم اے شہریار | کہ ماند ز تو در جہان یادگار

بناہاے آباد گردد خراب | ز باران و از تابش آفتاب

پے افگندم از نظم کاخ بلند | کہ از باد و باران نیابد گزند

بدین نامہ بر عمرہا بگذرد | بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

نہ زینگونہ دادی مرا تو نوید | نہ این بودم از شاہ گیتی امید

بد اندیش کش روز نیکی مباد | سخن ہاے نیکم بہ بد کرد یاد

بر پادشا پیکرم زشت کرد | فروزندہ اخگر چو انگشت کرد

اگر منصفی بود از راستان | کہ اندیشہ کردی درین داستان

بگفتی کہ من در نہاد سخن | بداد ستم از طبع داد سخن

جہان از سخن کردہ ام چون بہشت | ازین بیش تخم سخن کس نکشت

سخن گستران بیکران بودہ اند | سخنہاے اندازہ پیمودہ اند

ولیک ارچہ بودند ایشان بسے | بگانانہ گفتست ازینسان کسے

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی

جہاندار اگر نیستی تنگدست — مرا بر سر گاہ بودے نشست

کہ سفلہ خداوند ہستی مباد — جوانمرد را تنگ دستی مباد

بدانش نبد شاہ را دستگاہ — دگرنہ مرا برنشاندے بگاہ

چو دیہیم دارش نبد در نژاد — ز دیہیم داراں نیاورد یاد

اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر

دگر مادر شاہ بانو بدے — مرا سیم و زر تا بزانو بدے

چو اندر تبارش بزرگی نبود — نیارست نام بزرگاں شنود

کف شاہ محمود عالی تبار — نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

چو سی سال بردم بہ شہنامہ رنج — کہ شاہم ببخشد بپاداش گنج

مرا زیں جہاں بے نیازی دہد — میاں یلاں سرفرازی دہد

بپاداش گنج مرا در کشاد — بمن جز بہاے فقاعے نداد

فقاعے بیرزیدم از گنج شاہ — ازاں من فقاعے خریدم براہ

پشیزے بہ از شہریار چنیں — کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دیں

پرستارزادہ نیاید بکار — اگر چند دارد پدر شہریار

سر ناسزایاں برافراشتن — ورایشاں امید بہی داشتن

سر رشتۂ خویش گم کردنست — بجیب اندروں مار پروردنست

درختے کہ تلخست ویرا سرشت — گرش در نشانی بباغ بہشت

ور از جوے خلدش بہنگام آب — بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سر انجام گوہر بکار آورد — ہمہ میوۂ تلخ بار آورد

بہ عنبر فروشاں اگر بگذری — شود جامۂ تو ہمہ عنبری

دگر تو شوی نزد انگشت گر — ازو جز سیاہی نیابی دگر

ز بدگوہراں بد نباشد عجب — نشاید ستردن سیاہی ز شب

بنا پاک زادہ مدارید امید | کہ زنگی بشستن نگردد سپید
ز بد اصل چشم بہی داشتن | بود خاک در دیدہ انباشتن
چو پروردگارش چنیں آفرید | نیابی تو بر بند یزداں کلید
بزرگی سراسر بگفتار نیست | دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست
جہاندار اگر پاک نامی بدے | دریں راہ دانش گرامی بدے
شنیدی چو زینگونہ گونہ سخن | ز آئین شاہاں و رسم کہن
دگرگونہ کردی بکامم نگاہ | نگشتی چنیں روزگارم تباہ
ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند | کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کزیں پس بداند چہ باشد سخن | باندیشہ از پند پیر کہن
وگر شاعراں را نیازار داد | ہمہ حرمت خود نگہدار داد
کہ شاعر جو رنجد بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا
بنالم بدرگاہ یزدان پاک | فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

کہ یارب روانش باتش بسوز
دل بندہ مستحق بر فروز

جوں ہی محمود نے یہ اشعار ہجویہ پڑھے جن میں فردوسی نے فحش گالیاں دی تھیں سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ایاز سے کہا کہ مجھے ان گالیوں کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا فاضل شاعر کے آزردہ ہونے نے مجھے صدمہ دیا ہے۔ فوراً حسن میمندی طلب ہوا اور اس کے آگے محمود نے یہ ہجویہ اشعار رکھدئیے۔ وہ دیکھتے ہی زرد پڑ گیا اور اب اُسے کوئی جواب نہ آیا۔ آخر رحیم سلطان نے کہا تو جانتا ہے فردوسی نے مجھے یہ گالیاں نہیں دی ہیں بلکہ تو نے دی ہیں۔ کیونکہ اس ساری خرابی کا باعث تو ہی ہوا ہے۔ حسن میمندی کا یہ عالم تھا کہ کاٹو تو خون نہیں خود اُس نے زیادہ سزا دینی مناسب نہ جانی۔ صرف اپنے ہاں سے اس کا نام کاٹ دیا اور کہا کہ ہماری سرحد میں نہ رہیو۔ اور آپ فردوسی

کی اس تکلیف کی مکافات میں مشغول ہوا۔ یہ محمود کی شائستہ اور کریم طبیعت کا خاصہ تھا کہ ان گالیوں سے بجائے خفا ہونے کے وہ اور شرمندہ ہوا۔ اور اس نے یہ فقرہ سخت رقت انگیز لہجہ میں کہا " فردوسی نے بے انصافی نہیں کی بیشک اُسے تکلیف ہی ایسی پہنچی تھی کہ جس سے اس نے یہ گالیاں مجھے دیں۔ کیا میں اسی قابل تھا کہ اپنے دیرینہ تیس پینتیس برس کے ملازم سے گالیاں کھاؤں نہیں بلکہ شیطان نے (یعنے میمندی نے) مجھے گمراہ کیا" یہاں تو یہ کیفیت ہوئی اور وہاں فردوسی غزنی سے نکل قہستان پہنچا۔ فردوسی پرگو وہ غزنی سے بھاگ کر چلا آیا تھا لیکن انتہا درجہ کا خوف طاری رہتا تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہیں مجھے محمود کی خوشامد سے کوئی پکڑ کر محمود کے حوالہ نہ کر دے۔ اس کی عمر اسی برس کی ہو چکی تھی اور جو کچھ اسے کرنا تھا۔ وہ کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس نظارہ کے دیکھنے کا مشتاق تھا کہ میری شہرت کے ساتھ محمود کی نا انصافی بھی مشہور ہو۔ اور چاروں طرف سے اس پر لعن طعن پڑے میں اپنے کانوں سے سنوں جب فردوسی فیض کے دار الخلافہ قہستان میں پہنچا تو اپنے کو ایک سرائے میں چھپایا۔ سارے دن پڑا رہتا تھا اور شب کو شہر کی سیر کرنے نکلا کرتا تھا۔ فردوسی کی کوشش تھی کہ مجھے کوئی نہ جانے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ آفتاب لاکھ کچھ غلیظ بادلوں میں چھپتا ہے پھر بھی اس کی چمک نہیں رکتی۔ ابھی یہاں فردوسی نے آکر قیام بھی نہ کیا تھا کہ فردوسی کی ناچاقی اور محمود کی بے انصافی کی خبریں منتشر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی تھیں۔ اور ہر شخص کی زبان پر محمود اور فردوسی کا قصہ تھا *

جس سرائے میں فردوسی ٹھیرا ہوا تھا وہاں چند اور بھی لوگ قیام پذیر تھے۔ اور ان لوگوں سے اکثر شہر والے ملنے کے لئے آیا جایا کرتے تھے ایک دن فردوسی اسی جگہ یعنے سرائے کے بیرونی حصہ میں بیٹھا ہوا اپنے گذشتہ اور آیندہ خونی واقعات کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اس نے چند

شخصوں کو اپنے معاملہ میں گفتگو کرتے سُنا۔ ایک بولا حقیقت میں فردوسی پر ظلم ہوا دوسرے نے کہا کہ ہاں ظلم تو ہوا لیکن اُس نے بھی بہت بڑی بے اعتدالی کی کہ عطیۂ سلطانی اس حقارت سے شربت فروش اور حمامی کو دیدیا تیسرے نے کہا نہ فردوسی کا قصور ہے نہ سلطان محمود کا یہ سارا قصور حسن میمندی کا ہے۔ جب فردوسی نے یہ گفتگو سنی تو اسے بڑا تعجب آیا کہ میں نے یہ بات زبان سے بھی نہیں نکالی اور ابھی میں غزنی سے چلا آرہا ہوں مگر میرے آنے سے پہلے ہی سارے شہر میں اڑ گئی۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے کہا کہ یہ بھی تو (میری طرف اشارہ کرکے) غزنی سے ابھی آیا ہے اس سے صحیح حالات دریافت ہو جائینگے۔ یہ مشورہ کرکے وہ سب فردوسی کے پاس آئے اور انہوں نے دریافت کیا کہ تجھے محمود اور فردوسی کی رنجش کی بابت کچھ خبر ہے۔ فردوسی نے جواب دیا کہ میں بدنصیب شخص آپ ادھر کا ادھر پیٹ کے دھندہ میں مارا مارا پھرتا ہوں مجھے شاہوں کی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہوتی نہ میرے کان تک پہنچ سکتی ہیں +

یہ خشک جواب سُن کر انہوں نے پھر فردوسی سے کوئی بات نہ کی اور اُٹھ کر اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ گو فردوسی نے یہ کہکر انہیں ٹال تو دیا تھا۔ لیکن ایک ضعیف شخص نے فردوسی کی شستگی اور الفاظ کی بیساختگی سے یہ پہچان لیا کہ یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے ضرور کوئی نہ کوئی پڑھا لکھا اور شریف خاندان کا آدمی ہے۔ اس نے اپنا یہ شبہہ اس وقت اپنے ہی تک رہنے دیا کیونکہ اس نے مناسب نہ جانا کہ اپنا شبہہ ان لوگوں پر ظاہر کرکے اس غریب الوطن شخص کو ایسی حالت میں مصیبت میں ڈالوں کہ جب وہ ان کی صورت سے نفرت کرتا ہے۔ بوڑھا جہاندیدہ اور مردم شناس تھا وہ تیور سے پہچان لیتا تھا کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور اس کی کتنی قابلیت ہے۔ ابھی تک اس نے یہ قرار نہیں دیا تھا۔ کہ یہ فردوسی ہے لیکن قیافہ اور گفتگو سے یہ ضرور دریافت کرلیا تھا۔ کہ یہ ہے کوئی

علی گوہر

غیر معمولی شخص۔ غرض شب کو تنہائی کے وقت وہ بوڑھا جو زمانہ کا بہت سرد و گرم دیکھے ہوے تھا فردوسی کے پاس آیا اور اِدھر اُدھر کی ایسی دلچسپ باتیں کیں کہ فردوسی کی طبیعت اچاٹ نہوئی اور وہ بغور اس کی باتیں سنتا رہا۔ اثنائے گفتگو میں محمود کا بھی ذکر آگیا۔ اس وقت بوڑھے فردوسی کی زبان سے نہایت گرم گرم الفاظ نکلے۔ وہ سمجھ گیا کہ ہو نہو یہ فردوسی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بوڑھے نے اپنے دوست بوڑھے فردوسی سے اقرار کرالیا کہ میں فردوسی ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ بوڑھا فردوسی کو اپنے گھر لے آیا اور بڑی خاطر داری سے اُسے مہمان رکھا اور یہ کہدیا کہ تم کچھ فکر نہ کرنا ناصر لک ایسا غیر حمیت نشاہ نہیں ہے کہ تجھ ایسے قابل بوڑھے شخص کو ہاتھی کے پیر سے بندھنے کے لئے دیدیگا۔ ابھی چند ہی روز فردوسی بوڑھے کے ہاں رہا ہوگا کہ ناصر لک شاہ فیض کو خبر ہو گئی۔ اس نے نہایت اعزاز سے اپنے دربار میں فردوسی کو بلایا اور سلطانی نوازشیں فرمائیں۔ فردوسی نے کل کیفیت حرف بحرف سنادی۔ ناصر لک کو سخت رنج ہوا اور حسن میمندی پر کل دربار میں حقارت کے نعرے بلند ہوئے۔ محمود اور ناصر لک میں باہم بہت بڑا تعلق تھا۔ اس نے فردوسی سے کہا کہ تو مجھ پر نوازش کریگا اگر اب اپنی زبان شکایت بند کرے۔ یہ ایک لاکھ درہم تیری نذر ہے اور تجھ سے التجا کی جاتی ہے کہ تو سلطان کی نسبت نہ تحریراً نہ تقریراً ایک حرف بھی نہ کہے۔ فردوسی نے ناصر لک الملقب بہ محتشم کے فرمان کے بموجب قبول کرلیا۔ اور خود ہجویہ ابیات سے بہت پشیمان ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ جب اپنا اور محمود کا انصاف خدا پر چھوڑ دیا تھا پھر اِن ہجویہ بیتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خیر اب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس کی مکافات اب کسی بات سے نہیں ہو سکتی۔ ناچار فردوسی نے ناصر لک الملقب بہ محتشم کے ذریعے محمود کی خدمت میں مفصلہ ذیل ابیات لکھکر روانہ کیں وہ بیتیں یہ ہیں *

بغزنی مرا گرچہ خوں شد جگر ۔۔۔ زبیداد آں شاہ بیداد گر

گزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام — شنید از زمیں آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغاں ہا کنم — بگیتی از و داستاں ہا کنم
چو از نیکوئی ہا درو غم بخواست — ازاں پس در آیم بہ بدہاے راست
بگویم ز مادرش و نیز از پدرش — نترسم بغیر از خداوند عرش
کنم روسیہ آنچناں از نخست — کہ نتواند آخر بہ ہیچ آب شست
چو دشمن ملے داند از دوست باز — بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم — نہ دانم کزیں بیش سر چوں کشم
فرستادم از گفتہ داشتم — بہ نزدیک خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا ناصواب — بسوزاں ز آتش بشو آں در آب
گذشتم ایا سرور نیک راے — ازیں داوری تا بدیگر سراے
رسد لطف یزداں بفریاد من — ستاند بمحشر از و داد من

ان بیتوں کے ساتھ ناصر لک نے ایک عریضہ بھی محمود کی خدمت میں بھیجا جس کا یہ مضمون تھا کہ حضور نے معمولی بات پر کیوں اتنا دند مچایا۔ ایسے بڑے لایق شخص کی شکستہ خاطری ایسے عظیم الشان حکمران کے لئے سخت زبوں ہے۔ میں نے ہر چند اسے سمجھایا لیکن اس کو دربار سے کچھ ایسی تکلیف پہنچی ہے کہ وہ ہر دم آہ کے نعرے مارتا ہے۔ میری رائے میں بہتر ہوگا اگر دربار کی طرف سے ہمراہ زر موعود ایک معذرت نامہ بھی فردوسی کو بھیجا جائے۔ اس سے دربار کی قدردانی کی دھوم ہوگی اور بوڑھے فردوسی کا زخم دل بھر آئیگا۔ عریضہ عین جمعہ کے دن محمود کو پہنچا۔ ابھی ظہر کی نماز پڑھ چکا تھا کہ عریضہ ناصر لک کا حاضر خدمت کیا گیا۔ عریضہ پڑھتے پڑھتے جب محمود کی ان دو بیتوں پر نگاہ پڑی تو مارے خوف کے کانپنے لگا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اور اس نے اپنی جھرجھری آواز سے ان شعروں کو بار بار پڑھا:

گذشتم ایا سرور نیک راے — ازیں داوری تا بدیگر سراے

رسد لطف یزداں بفریاد من — ستاند بمحشر ازو داد من

محمود چونکہ ایک باایمان مسلمان تھا اور کامل طور سے اس کا عقیدہ جزا و سزا پر تھا اسے اس قدر ان اشعار کے پڑھنے سے خوف معلوم ہوا کہ وہ کانپنے لگا اور خدا کے غضب کا فوٹو اس کی آنکھوں کے آگے کھینچ گیا۔ سلطان محمود نے ان لوگوں کو جو فردوسی کے خلاف سازش کرتے تھے اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ حسن میمندی پہلے ہی نکالا جا چکا تھا۔ سلطان نے نہایت جذبہ کی حالت میں یہ ارشاد کیا ؛

چو فردوسی آں مرد والا گہر — غمیں شد ز میمندی بے ہنر
اذیت بسے زاں فرومایہ دید — واز و بے سبب رنج و حرماں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد — سرش بادم تیغ انباز کرد

یہاں محمود تو اپنے کئے کے پچھتاوے میں رہا اور وہاں ناصر لک نے فردوسی سے دوستانہ کہا کہ میں سلطان محمود کا خراجگذار ہوں مجھ میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ میں تیرے واسطے اس کا مقابلہ کر سکوں گا بہتر ہے کہ تو یہاں سے چلا جا تا کہ میں بہانہ کر سکوں کہ وہ یہاں سے چلا گیا۔ اور اگر اس نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ فردوسی کو یہاں روانہ کر دو اس وقت میرے لئے بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑیگا اگر میں نے تمہیں حوالہ کر دیا تو میری حمیت اور انسانیت میں فرق آیا۔ اور جو میں نے نہ دیا تو میرے ملک کی اینٹ سے اینٹ بج جائینگی۔ مناسب یہی ہے کہ اے فاضل شاعر تو یہاں سے چلا جا ؛

فردوسی نے بھی مناسب جانا کہ میں فیض کو چھوڑ دوں اور ایک دن علی الصباح ماژندراں کی جانب روانہ ہوا۔ یہ ملک بھی محمود کے زیر نگیں تھا۔ یہاں قابوس بن شکر بن منوچہر بن شمس المعالی حکومت کرتا تھا۔ ماژندراں کی آب و ہوا فردوسی کو اچھی معلوم ہوئی۔ روپیہ اس کے پاس بیٹھکے کھانے کو بہت تھا۔ اسے بڑا فکر یہ لگا ہوا تھا کہ اپنی زندگی میں شاہنامہ پر نظر ثانی کر جاؤں۔ مبادا میر طائر

روح اس ضروری فرض کی انجام دہی سے پہلے کوچ کر جائے۔ ماژندراں میں فردوسی نے اس عظیم الشان فرض کی انجام دہی کی اور نہایت خوش اسلوبی سے شاہنامہ کو ترتیب دی۔

ز غزنی چو فردوسی آمد بروں — ازانجا بماژندراں شد بروں
بگسترد آنجا بساط سخن — وزو شد حکایت بہر انجمن
باصلاح شاہنامہ کرد او بسیچ — حشو اندراں نامہ نگذاشت ہیچ
دراں بودم و برچوں توفیق نمود — بشاہ نامہ دردالیش کاسفزود
بہ نظمیکہ بر نثر مسند نہاد — بہ شعرے کہ شعرے بپایش فتاد
ستایش چناں کرد آں شاہ را — کہ در تیرہ شب گمرہاں ماہ را

فردوسی نے مصلحتاً قابوس کی تعریف کی اور یہ خبر بعدازاں آناً فاناً میں قابوس کے دربار تک جا پہنچی کہ فردوسی اتنے دن سے یہاں مقیم ہے۔ قابوس نے فوراً فردوسی کو اپنے دربار میں بلایا اور بڑی خاطرداری سے اپنے پاس مسند پر بٹھایا فردوسی نے نظرثانی کئے ہوئے شاہنامہ کی نذر دی۔ اور کہا کہ اس کتاب کو حضور کے نام سے معزز کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی قابوس ڈر گیا اور اس نے فردوسی کا شکریہ کرکے یہ جواب دیا کہ میری یہ مجال نہیں ہے کہ میں اپنے آقا محمود کے مقابلہ میں اپنے نام پر شاہنامہ کو شہرت دوں۔ بلکہ میں یہ التجا کرتا ہوں کہ تم ماژندراں کو چھوڑ دو مبادا کوئی بُری بات پیدا ہو۔ فردوسی قابوس کی اس شفقت سے بہت خوش ہوا اور پائے تخت سے روانہ ہونے کا مصمم ارادہ کیا قابوس نے ایک لاکھ پچیس ہزار درم اور قیمتی جواہرات کا ہار دو ماژندرانی گھوڑے فاضل شاعر کا رخصتانہ بھجوایا۔ فردوسی نے نہایت ممنونی کے ساتھ لے لیا۔

چو فردوسی آں جود و اشفاق دید — گزیدہ سخن ہائے والی شنید
پذیرفت و بر اوج خاطر نگاشت — ہمہ ہوش دل بر عزیمت گماشت

گرفت آں عطار او بس شاد شد ۔۔۔ ازانجا گہ سوے بغداد شد

فردوسی نے دل میں خیال کیا کہ محمود ہی کی سرحدوں میں پھرنا سخت خوفناک ہے مبادا کوئی بیہودہ محمود کی خوشامد سے مجھے پکڑ کر غزنی روانہ کردے تو مفت میں یہ سفید داڑھی خاک وخوں میں لوٹے گی۔ یہ خیال فردوسی کا شکستہ خاطری کی وجہ سے اور بھی دماغ میں گردش لگا رہا تھا۔ ورنہ محمود کی مہربانی اور تحمل میں کبھی کلام نہیں ہوسکتا جو اس نے فردوسی کے ساتھ کیا۔ تاہم اسے اپنی زندگی کا بہت خوف تھا۔ گو وہ یہ سُن بھی چکا تھا کہ میرے سبب سے حسن میمندی معہ اپنی جماعت کے نکالا گیا لیکن خوف جان سے اس کا اطمینان سخت زوال پذیر ہوگیا تھا۔ اور اب اس نے یہی بہتر جانا کہ یہاں سے بغداد کی طرف چلدو۔ چنانچہ اس نے اپنے منشا کے مطابق سفر کیا اور ایک قافلہ کے ساتھ نہایت آرام سے بغداد کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس وقت فردوسی کو یہ معلوم ہوا کہ میں امن میں آگیا کیونکہ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں محمود کے ہاتھ نہ پہنچ سکتے تھے۔ یہاں کی شادابی اور سرسبزی فردوسی کو بھاگئی اور اس نے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ یہیں صرف کردونگا۔ یہاں فردوسی کسی کو نہ جانتا تھا۔ گو اس کے جاننے والے دربار میں بعض بعض لوگ تھے۔ تاہم وہ اسے پہچان نہ سکتے تھے جب تک کہ وہ خود ہی ظاہر نہ کرے۔ فردوسی چاہتا تو نہ تھا کہ درباری کشمکش میں پڑوں لیکن پھر بھی حکومت اور عزت کی خواہاں روح نے اس کی رہنمائی دربار کی طرف کرنی چاہی وہ کئی مہینے تک اجنبیوں کی طرح شہر بغداد میں مقیم رہا۔ ایک دن ایک غزنی کے تاجر سے فردوسی کی ملاقات ہوئی جو اسے خوب پہچانتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی فردوسی کو کھل گیا اور اس نے پرشوق جذبہ میں فردوسی کو اپنے گلے لگایا اور بغداد میں آنے پر مبارکباد دی۔ فاضل شاعر نے محمود اور اس کے دربار کا حال دریافت کیا۔ اس نے نہایت خوش ہوکر پہلا یہ جملہ کہا کہ جنہوں نے تیرے خلاف سازش کی تھی

وہ معہ خواجہ حسن میمندی کے دربار سے نکال دئیے گئے۔ یہ سُن کر فاضل شاعر بہت خوش ہوا اور اس نے جو ہجو سلطان محمود کی کی تھی اس پر اپنی پشیمانی ظاہر کی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب اس کا بغیر نشانہ کے لگے واپس آجانا ناممکنات سے تھا۔ بعد ازاں وہ تاجر فردوسی کو اپنے گھر لے گیا اور نہایت خاطرداری سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ فردوسی کو یہ بھی اطمینان دیا کہ میں تجھے وزیر اعظم سے ملوا دونگا اور دربار خلیفہ تک تیری رسائی ہو جائیگی۔ چند روز کے بعد فردوسی وزیر اعظم کے پاس پہنچا اور عربی زبان کا ایک قصیدہ اس کی مدح میں پیش کیا۔ وہ قصیدہ دیکھتے ہی دنگ رہگیا۔ اس نے اٹھ کر فاضل شاعر کی لبوں پر بوسہ دیا اور ہاتھ چوم لئے اور کثرت سے روپیہ اور ایک گراں بہا خلعت انعام میں دی۔ فاضل شاعر یہ لاثانی قدردانی دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔ تمام وہ کدورتیں جن کا اثر ہنوز فردوسی کی بوڑھی طبیعت پر باقی تھا بالکل جاتی رہیں ہاں اس قدر افسوس ہوا کاش میں یہیں پیدا ہوتا اور یہیں بڑا ہوتا اور یہیں اپنی لیاقت قربان کردیتا تو آج کو کہیں کا گورنر مقرر ہوتا۔ یہ پریشانی اور دشت و در چھاننے نہ پڑتے۔ مگر اب کیا تھا چوراسی برس کی عمر ہو چکی تھی زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی نہ جاہ کی۔ فردوسی جب وزیر کے ہاں سے کامیاب واپس آگیا تو اپنے دوست تاجر سے مشورہ لیا کہ میں خلیفہ کی خدمت میں یہ شاہنامہ پیش کردوں۔ اس نے کسی قدر تامل کے بعد یہ جواب دیا۔ میری یہ رائے نہیں ہے مبادا وہ شاہنامہ کو دیکھ کر ناراض ہوجائے کیونکہ خلیفہ کفار کی بیجا تعریف سے ناراض ہوتا ہے اور شاہنامہ میں آتش پرست بادشاہوں کے کارنامے ہیں۔ بہتر ہے کہ تو بغداد کی تعریف میں کچھ اشعار نظم کرکے خلیفہ کی خدمت میں پیش کر۔ وہ زیادہ مناسب اور موزوں بات ہوگی +

فاضل شاعر کی سمجھ میں اپنے دوست تاجر کی یہ نصیحت بخوبی آگئی اور وہ سمجھ گیا کہ لائق دوست نے یہ بات بہت موقع کی بتادی ہے۔ اس نے فوراً

اشعار موزون کئے اور ایک ہزار ابیات کہکر خلیفہ کی خدمت میں بذریعہ وزیر اعظم پیش کیں۔ خلیفہ بہت خوش ہوا اس نے اپنے پرشان تخت کے پاس فاضل شاعر کو بیٹھنے کی ایسی حالت میں اجازت دی جب سب درباری دست بستہ کھڑے ہوئے تھے اور کہا خدا سے میری ہمیشہ یہی دعا رہتی ہے کہ میرے دربار میں علم ذلیل نہو۔

فردوسی کی خوشی کا کوئی عالم نہ پوچھا جائے ایسا عظیم الشان خلیفہ اور وہ فاضل شاعر کی ایسی عزت کرے اور عزت بھی خشک نہیں بلکہ عین دربار میں اس پر گوہر نثار کئے گئے۔ اور اسے جواہرات سے لاد دیا۔ پھر فردوسی نے بغداد میں آنے اور یہاں مقیم ہونے کی ساری کیفیت بیان کی۔ خلیفہ نے بہت زور سے کہا اب بیخوف ہو جاؤ اس لئے کہ تم امن کی جگہ میں آ گئے۔ یہاں تم سے کوئی بھی آنکھ نہیں ملا سکتا"۔ فردوسی نے یہ جانفزا بشارت سُن کر تخت کے پائے کو بوسہ دیا اور فی البدیہ چند اشعار خلیفہ کی قدردانی کی بابت پڑھے اور اپنی عاجزی اور خلیفہ کی بندہ نوازی کا فوٹو نہایت پراثر اور پرزور اشعار میں کھینچا۔

گو فردوسی کی عمر کنارہ موت تک پہنچ گئی تھی۔ اور اب اُس کے بچنے میں کوئی دقیقہ باقی رہا تھا لیکن خلیفہ کی گوناگون مہربانیوں نے اسے اور بھی چند سال کے لئے چنگا کر دیا۔ وہ روزمرہ نئے نئے قصیدے اسلامیوں کی شجاعت اور ثابت قدمی کی تعریف میں سُناتا تھا اور تمام دربار مرحبا و صد مرحبا کے نعرے بلند کرتا تھا۔ یہاں فردوسی کا نہ کوئی دشمن تھا نہ حاسد تھا نہ کوئی اس کے خلاف سازش کرنے والا تھا جیسا کہ اکثر مشرقی درباروں کا خاصہ ہوتا ہے۔ ادنے درباری سے لیکر اعلیٰ درباری تک سب فردوسی سے محبت کرتے تھے اور اپنی حیثیت کے مطابق ہر متنفس اس کی خدمت کرتا تھا۔

ابھی فردوسی کو بغداد میں آئے ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ غزنی میں فردوسی کی بابت خبریں نئے نئے لباس میں مشہور ہونی شروع ہو گئیں

گو بغداد میں فردوسی کے داخل ہوتے ہی پہلے غزنی میں خبر تو پہنچ گئی تھی لیکن اس عزت افزائی کی خبروں نے بھی دربار غزنی میں جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ محمود کو متواتر یہ خبریں لگ رہی تھیں کہ دربار بغداد میں دربار غزنی پر حقارت کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور ہر شخص محمود کی اس ناانصافی پر تف تف کرتا ہے۔ یہ خبریں محمود کے خون میں غضب انگیز جوش برپا کرنے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھیں۔ جوں جوں وہ یہ سنتا تھا کہ فردوسی کی مظلومیت پر افسوس کیا جاتا ہے اور دربار غزنی کے قصائی پنے اور اس صریح ناانصافی پر حقارت کے نعرے مارے جاتے ہیں تو اسے رنج کے ساتھ غصہ ہوتا تھا۔ اس کی پشیمانی انتہا درجہ پر پہنچ چکی تھی اور وہ سخت پریشان تھا اور پشت دست کاٹتا تھا کہ میں حسن میمندی کے بہکانے میں کیوں آگیا۔ اور کیوں یہ بدنامی مول لی اور کبھی بغداد کے دربار پر غصہ آتا تھا کہ وہ کیوں خواہ مخواہ حقارت کے نعرے بلند کرتا ہے۔ اس پشیمانی اس غصہ اس پچھتاوے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود نے ایک گرم رقعہ خلیفہ بغداد کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

"مجھے سن کر افسوس ہوا کہ بلاوجہ ایک خادم اسلام پر نفرین ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فردوسی نے میری نسبت جا کر کیا کہا ہے۔ لیکن ہاں یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ اس نے میری شکایت ایسے جلے بھنے الفاظ میں کی ہے۔ کہ دربار بغداد اس سخت بیرحمی کے ساتھ میری مخالفت کرتا ہے۔ میں بغداد کو اسلام کا پائے تخت جانتا ہوں ورنہ اس توہین کا عوض میرا پرشان جلال بخوبی لے سکتا تھا۔ میرا تحفظ مراتب خود میرا اجلال کرتا ہے۔ کیا دربار بغداد نے میرے خونخوار لشکر کی میدان ہند میں بہادریاں نہیں سنی ہیں۔ کیا میرے مہیب ہاتھیوں کی وحشت ناک صفیں نہیں دیکھی ہیں۔ جب ہی تو شاید یہ جرات ہوئی ہے کہ عین دربار میں مجھ ایسے خادم کی تذلیل کی جاتی ہے۔ آیندہ مجھے امید ہے کہ میں ایسی ناموزون خبریں جن کی وجہ سے میں اپنے تحفظ مراتب

کے لئے مستعد ہوں میرے کان میں نہ آئینگی اور میرے فیلان کوہ تمثال کو اپنی سونڈیں بغداد کی طرف گوش دینے کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑے گی"۔ یہ رقعہ سلطان محمود نے خلیفہ بغداد کو روانہ کیا۔ خلیفہ نے صرف دو لفظ جواب میں لکھے اور وہ یہ تھے "الم والسلام" جوں ہی محمود نے یہ جواب دیکھا سخت متحیر ہوا کہ ان دو لفظوں میں اتنے بڑے نامہ کا جواب کیونکر ادا ہوگیا۔ جب زیادہ تامل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ بغداد نے ہاتھیوں کے جواب میں لکھا تھا +

الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل

یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب یمن کا ویسرائے مکہ پر اپنے ہاتھیوں کی فوج لیکر چڑھ آیا تھا اور خدا نے ابابیلوں کو حکم کیا تھا کہ اپنی چونچوں میں کنکر لیکر اصحاب فیل پر ڈالو۔ چنانچہ جو کنکری پڑتی تھی۔ وہ سوار کے سر پر پڑکر ہاتھی کے پیٹ میں سے نکل جاتی تھی غرض ابابیلوں نے بہت بڑی ہزیمت اصحاب فیل کو دی تھی۔ اس کی مفصل کیفیت اور سچی حقیقت اپنی کتاب سیرت محمدؐ میں لکھ چکے ہیں۔ یہی اشارہ خلیفہ بغداد کا بھی تھا کہ تمہارے ہاتھیوں کی بھی وہی نوبت ہوگی کہ جو اصحاب فیل کے مہیب جانوروں کی ہوئی تھی۔ یہ دو لفظی جواب دیکھ کر محمود بہت خوش ہوا اس نے ایک نامہ بھیجکر خلیفہ سے معافی مانگی اور لاکھوں روپیہ کے تحفے تحایف خلیفہ بغداد کی خدمت میں بھیجے +

خلیفہ نے سلطان محمود کے نذرانہ کا بہت بڑا حصہ فردوسی کو بخشا۔ وجہ یہ تھی کہ فردوسی فاضل اور خلیفہ فاضل پرست۔ پھر کیوں نہ عزت اور توقیر فاضل شاعر کی دربار میں ہوتی۔ اہل ہنر کو ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے +

سر از جیب اقبال بیروں کند	ہنر پایۂ مرد افزوں کند
چو ظل ہمایش دہد پایۂ	ہنر ہر کجا افگند سایۂ
ہنرمند ہر جا بود سرفراز	کجا بے ہنر شد اسیر نیاز
کہ کام دو گیتی ازو یافتم	بسوئے ہنر روئے از آں تافتم

هنر از خرد دست پابستہ تر بدن راز جاں گشتہ شائستہ تر

خلیفہ بغداد فردوسی کا دل سے شیدا تھا اور بوڑھے فاضل کی ہر طرح دست گیری کرتا تھا جو کچھ رنج دربار غزنی سے فردوسی کو پہنچا تھا اس کی مکافات کے علاوہ زبانی اطمینان بھی دیا کرتا تھا۔ پھر فردوسی نے خلیفہ کے اشارہ سے یوسف کا قصہ نظم کرکے پیش کیا۔ خلیفہ کو ازحد خوشی ہوئی اس نے حکم دیا کہ اس کی نقلیں ہو ہو کر ہماری محروسہ ممالک میں بھیجی جاویں۔ اور ہر رئیس بحفاظت اسے اپنے پاس رکھے فردوسی کو اب کامل آرام مل گیا تھا اور اس نے اپنے دل میں یہ ارادہ کرلیا تھا کہ بغداد ہی میرا مدفن بنیگا۔ گو اپنے خاص مولد میں جان دینے کی آرزو اس کے دل میں مضمر بھید کی طرح آرہی تھی لیکن بمجبوری اس نے بمشکل اپنے دل کو اسی پر مایل کرلیا تھا کہ بغداد سے بہتر اور کوئی جگہ دنیا میں نہ ملے گی جہاں مردہ میں کیڑے بھی نہیں پڑتے اور یوں ہی خشک ہو جاتا ہے۔ خیر مرنے کے بعد تو جو کچھ ہوا کرے لیکن زندگی میں فردوسی کی یہ خواہش نہ تھی کہ خلیفہ کا ظل ہمایوں چھوڑ کر چلا جاؤں کیونکہ اس نے اسی خلیفہ کے سایہ میں امن دیکھا تھا +

چو در ظل والی درا جائے شد چو طوطی بشکر شکر خائے شد

برآسودہ در ظل امن و اماں زبیداد سلطان جور زماں

آخر بڑی مدت کے بعد فردوسی کی قسمت پھری اور زمانہ نے چاہا کہ بوڑھا فاضل شاعر اپنے مولد ہی میں جان دے۔ اسی اثنا میں سلطان محمود کو ایک باغی کی سرکشی فرو کرنے کے لئے بذات خود حملہ کرنا پڑا۔ محمود چاہتا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے دو لفظی جواب ایسا لکھا جائے کہ اس میں کل مطلب آجائے۔ اہل دربار میں سے چند لوگوں نے کہا فردوسی کا یہ شعر کافی ہے +

اگر جز بکام من آید جواب

من و گرز و میدان افراسیاب

یہ سنتے ہی محمود نے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ فردوسی کے اشعار سے تو میں اتنا

بڑا کام لوں اور وہ بیچارہ یوں میرے ڈر سے محروم وخستہ دل ہو کر بھاگ گیا - حیف ہے
اپنے اسی تاسف کناں لہجہ میں یہ الفاظ بھی زبان سے نکالے "آں بیچارہ از ما منتفع
نشد و از شعہ انوار معارف ما پرتوی در شبستان امال او منعکس نہ گشت" - یہ کہکر
سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اپنی گذشتہ غلط فہمی پر سخت تاسف
کیا اور پھر اسی جوش قدردانی کی حالت میں یہ کہا +

سہ دہ سال رنج و مشقت کشید	کہ تا نظم شاہ نامہ درہم کشید
بسے غوص در بحر خاطر نمود	در فکر ز اندیشہ بر دل کشود
دراں راہ چنداں لگاد براند	کہ کافور بر مشک و عارض نشاند

بعد ازاں سلطان محمود نے اسی وقت حکم دیا کہ ساٹھ ہزار اشرفیاں طوس بھجوادی جائیں
اور اس کو بغداد میں اپنے ہاتھ سے ایک معذرت نامہ بھیجا اور لکھا کہ جو کچھ بے
اعتدالی یا غلط فہمی چند شیاطین کے اغوا سے کی گئی اس کی میں تجھ سے معافی چاہتا
ہوں اور یہ زر موعود ارسال خدمت ہے تجھ سے امید ہے کہ تو اسے قبول کریگا - خزانہ
روانہ ہونے سے پہلے یہ معذرت نامہ فردوسی کو پہنچ گیا اس نے خدا کا شکر کیا کہ اپنی
عمر کے آخری دن اپنے وطن طوس میں گزاروں گا - ہرچند خلیفہ نے فردوسی کو
روکا لیکن شوق وطن رگ و پے میں دوڑ گیا تھا - آخر نہایت عزت سے دربار بغداد
سے رخصت ہو کر شاداب میں پہنچا - ابھی زر موعود کے آنے میں دو ایک دن کا
عرصہ تھا کہ فردوسی ایک بڑی شاہرہ میں جا رہا تھا جہاں اس نے ایک نابالغ بچہ
کی زبانی یہ شعر سُنا جو نہایت ذوق شوق میں پڑھتا چلا جا رہا تھا +

شعر

اگر شاہ را شاہ بودے پدر
بسر بر نہادے مرا تاج زر

سنتے ہی فردوسی کے دل پر ایک گھونسا سا لگا اور اپنی عمر عزیز یاں ما و رحس چہانتھا
در حصول غوض ناکامیوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی - اس نے اپنی

اس بے بسی اور جان کے خوف سے چھپے چھپے پھرنے پر حسرت ناک نظروں سے دیکھا اور چاروں شانہ چت بیہوش جا پڑا۔ لوگ اس بیچارہ کو گھر اٹھا کر لے گئے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ دربار غزنی سے نکلنے کے بعد ہر جگہ اس کی بہت بہت کچھ خاطر و مدارات ہوتی رہی اور غالباً اسے انعام بھی ساٹھ ہزار اشرفیوں سے زیادہ مل چکا تھا۔ لیکن جب ایک دفعہ دل ٹوٹ چکا تھا۔ پھر اس کا جڑنا مشکل تھا۔ محمود کی طرف سے معذرت نامہ بھی پہنچ گیا تھا اور زر موعود بھی آ رہا تھا مگر شکستگی جوں کی توں باقی تھی اور جب اپنی اس بیغیرتی پر خیال آتا تھا تو بوڑھا شاعر خون کے آنسو اپنی سفید ڈاڑھی پر بہانے لگتا تھا۔

دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں
اس عمارت کو ذرا دیکھکے ڈھایا ہوتا

القصہ فردوسی کو بیہوشی کی حالت میں گھر اٹھا کر لائے۔ بمشکل ایک دن جیا دوسرے دن بیچارے کی وفات ہو گئی۔ فاضل شاعر نے اپنی آنکھوں سے زر موعود کو نہ دیکھا اور حسرت و مایوسی کا ہمکنار ہو کر راہی ملک بقا ہوا۔ فردوسی کو نہلا دھلا کر دفن کرنے لے چلے تھے کہ اتنے میں ساٹھ ہزار اشرفیاں پہنچیں۔ جو لوگ زر موعود لیکر آئے تھے انہوں نے سلطان محمود کو لکھا کہ فردوسی کی وفات ہو گئی جب ہم یہاں پہنچے۔ اس کی بہن موجود ہے اب جو کچھ حکم ہو وہ کیا جائے۔ سلطان نے لکھ دیا کہ کل روپیہ بہن کو دیدو اور ہماری طرف سے تعزیت کر لینا۔

شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون زعالم شد

وہ ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کی بہن کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ اس نے عطیہ سلطان کو شکریہ کے ساتھ لے لیا اور طوس میں ایک بہت بڑی یادگار اس روپیہ سے فردوسی کی بنوائی۔ اس کا بہت بڑا مقبرہ بنایا گیا۔ اور اس کے گرد نہر دوبارہ کھود کر درست کی گئی۔ اس کی زمین پختہ کی گئی اور جیساکہ فردوسی

کا منشا تھا اس کے علاوہ کل باتیں پوری ہوگئیں - ایک مسافر خانہ اس کی یادگار میں بنایا گیا جواب تک موجود ہے - حکیم ناصر خسرو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس مسافر خانہ کا بیان لکھا ہے جو فاضل حکیم نے خود جا کر ملاحظہ کیا تھا - اتنے بڑے عظیم الشان شاعر کی زندگی یوں ختم ہوگئی +

شاہ نامہ

جنہیں فارسی کی شاعری دیکھنے کا مذاق ہے وہ جان سکتے ہیں کہ شاہ نامہ سے بہتر فارسی زبان کی دنیا میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی انگریزی زبان میں فرانسیسی اور اطالیہ زبان میں کئی بار ترجمہ ہوگیا ہے لیکن جو بیوٹی اصلی زبان میں ہوتی ہے غیر زبان میں جانے سے نہیں رہتی - فردوسی جس کو یورپینس نے دوسرا لقب مشرقی ہومر کا دیا ہے - عجیب وغریب لیاقت کا شخص تھا - ہم آگے چلکر شعراکے مقابلہ میں اس کی شاعری کے جوہر دکھائینگے اور اس کی لیاقت کا پورا فوٹو دکھینچینگے - لیکن اس جگہ ہم صرف شعراے نامی مشرقی کی راے اس کے شاہ نامہ کی نسبت تحریر کرتے ہیں اور پھر یہ لکھینگے کہ شاہ نامہ ایک جلد میں کیونکر جمع ہوگیا - تمام دنیا میں جنہیں فارسی زبان سے دلچسپی ہے اور جو مشرقی فضلا کی سوانح عمری دیکھنے کا لطف رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہندؤں کو جیسی اپنی مہابھارت پر فخر ہے مسلمانوں کو اس کے مقابلہ میں شاہنامہ پر ناز ہے - اور جیسے اہل مغرب کو ہومر کی الیڈ پر ناز ہے مسلمانوں کو شاہ نامہ پر فخر ہے اور وہ ان دونوں کتابوں کے جواب میں شاہ نامہ کو پیش کر سکتے ہیں +

اس کی بابت کہ غیر ملک کے مصنفوں کا اس کی نسبت کیسا خیال ہے میں علیحدہ طور پر لکھوں گا - اب صرف اپنے مشرقی شعرا کی عقیدتمندانہ پیار کس کا خلاصہ کرتا ہوں - جس سے معلوم ہو کہ ہمارے مشرقی شعرا میں کیسی انصاف پرستی تھی - اور وہ فردوسی کو کس پائیکا جانتے تھے - چنانچہ انوری ابیوردی

جو ایک بہت بڑا حکیم اور شاعر ہوا ہے اور جس کو پیغمبر شعراے کہا گیا ہے۔
یہ لکھتا ہے +

آفریں بر رواں فردوسی
آں ہمایوں نہاد فرخندہ
او کہ استاد بود ما شاگرد
او خداوند بود ما بندہ

ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فاضل حکیم نے کن مودبانہ الفاظ میں کس صدق دلی سے اپنے بزرگ شاعر کی توصیف کی ہے۔ الفاظ جس قدر سادے ہیں اسی قدر مضمون نہایت بلند پایہ ہے۔ صرف ان دو شعروں میں فاضل فردوسی کی اصلی ماہیت بیان کر جانی اور اس کی شاعری کی کامل داد دینی یہ حکیم انوری ہی کا حصہ تھا +

مگر مشرقی اخلاقی فلاسفروں کا سرگروہ سعدی جس کی گلستاں بوستاں نے الہامی کتابوں کے پہلو بہ پہلو اشاعت پائی ہے اور جس سے بہتر شاعری کی ماہیت کوئی نہیں جان سکتا وہ یہ تحریر کرتا ہے +

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت براں تربت پاک باد

سعدی جیسے عالی قدر اور نیچرل شاعر کی زبان سے فردوسی کی نسبت یہ نکلنا انتہا درجہ کی عظمت اور شوکت ظاہر کرتا ہے۔ پھر خدائے سخن نظامی لکھتا ہے جس کو فردوسی کے مقابلہ میں اپنی شاعری پر بہت بڑا ناز ہے اور جو خضر علیہ السلام کو اپنا استاد بتاتا ہے +

سخن گوئے پیشینہ دانائے طوس
کہ آراست روئے سخن چوں عروس

یہ فردوسی کا بہت بڑا کمال ہے کہ وہ جبراً ایسے مغروروں کی زبان سے اپنی صفت و ثنا کرا لیتا ہے ورنہ ایسے بڑے بڑے شاعر جو اپنے کو خدائے سخن سمجھیں بھلا کسی کی تعریف میں کیوں زبان کھولنے لگے +

پھر ایک اور زبردست شاعر فردوسی کی بابت یوں قلم فرسائی کرتا ہے اور

اس نے نہایت سچ کہا ہے +

اے تازہ و محکم زتو بنیاد سخن | ہرگز نکند چو تو کسے یاد سخن
فردوس مقام بادت اے فردوسی | انصاف کہ نیک دادۂ داد سخن

ان تمام عقیدتمندانہ ریمارکس سے جو فاضل اور نامور مسلم شعرائے گرامی نے کئے ہیں کتنی بڑی قابلیت فردوسی کی کھلتی ہے۔ اب ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کے اشعار کی خوبی بطور خود بیان کریں کیونکہ ہماری تحریر سے زیادہ اعتبار کے قابل مذکورالصدر شعرا کی تحریریں ہیں۔ ہاں آگے جا کے ہم مقابلہ ضرور کرینگے جس سے سمجھنے والا اندازہ کرلیگا کہ زور طبیعت اور بیساختگی کس میں ہے۔ پہلے ہم شاہ نامہ کے ایک جلد میں جمع ہونے کی تاریخ لکھتے ہیں پھر اس پر اپنی رائے قائم کرینگے۔ فردوسی نے جب دربار غزنی کو چھوڑا ہے تو ایک جلد شاہ نامہ کی مختلف ٹکروں میں چھوڑ گیا تھا۔ لیکن سر جارج ہملٹن کی تحریر کے مطابق یہ پایا جاتا ہے کہ جو حصہ شاہ نامہ کا وہ نظر ثانی کرچکا تھا وہ تو محمود کے پاس رہا کرتا تھا لیکن باقیماندہ حصہ وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس نے ماژندراں میں آکر اُسے درست کیا تھا۔ مگر عظیم سمرقندی سر جارج ہملٹن کے خلاف لکھتا ہے اور وہ یہ ہے" کوئی خاص نسخہ پورے شاہ نامہ کا فردوسی نے محمود کو نہیں دیا بلکہ یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا۔ کہ آٹھ دن میں جتنا تیار ہوا اسی قدر نظر ثانی کرکے پیش خدمت میں کردیا۔ اس طرح کل شاہ نامہ سلطان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب یہ خبر نہیں کہ آیا فردوسی کے چلا جانے کے بعد پھر شاہ نامہ ایک جلد میں کیا گیا یا اُس کے ٹکڑے ہی ٹکڑے رہے۔ ان مختلف تحریروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کل شاہ نامہ ایک جلد میں فردوسی کے سامنے جمع نہیں کیا گیا اور اگر جمع بھی کیا گیا تو اس کے بعد وفات ہوا ہوگا۔ اور جس شاہ نامہ کی ماژندراں میں اس نے نظر ثانی کی تھی وہ مسودہ تھا جو دربار غزنی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ فردوسی کی زندگی ہی میں شاہ نامہ کی شہرت تو خوب ہوگئی تھی لیکن

مختلف شہروں میں شاہ ناموں کے مختلف حصے رائج تھے اور پورا شاہ نامہ سوائے سلطانی کتب خانہ کے اور کہیں نظر نہ آتا تھا۔

عموماً کتابوں کی حفاظت اور علم کا تحفظ امن کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے۔ مگر ایران میں جہاں شاہ نامہ نے جنم لیا تھا محمود کی آنکھ بند ہوتے ہی فتنہ وفساد کھڑے ہو گئے اور ایک زمانہ تک برابر یہ جھگڑے برپا رہے۔ ایسی رستخیز کے زمانہ میں علمی باتوں کی طرف توجہ مبذول ہونی ناممکنات سے ہو جاتی ہے۔ اسی باعث سے اور بھی ایک سالم شاہ نامہ کا پتہ لگنا مشکل سے خالی نہ تھا۔ شاہ نامہ کی پراگندگی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی اور وہ یہاں تک تتر بتر ہو گیا تھا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے اس پریشانی کو اس مبالغہ کے ساتھ بیان کیا کہ جیسے کمر اور بال یا معدومیت کی نسبت میں مبالغہ ہوا کرتا ہے۔ مثلاً لطف علیخاں آذر تذکرہ آتشکدہ میں یہ لکھتے ہیں "حالا نمیتواں گفت کہ دریں کتاب شعرے از فردوسی باقی ماندہ۔ بازیچہ ماندہ بمقابل اشعار فصیح بلغاد افکار بلیغ فصحی در ہر باب شعر خوب وسخن مرغوب دارد" اس مبالغہ آمیز تحریر سے ہم اتنا مطلب نکال سکتے ہیں کہ فردوسی کے اشعار اس پریشانی سے ادھر اُدھر پڑھے گئے کہ آذر کو اتنا خوب معلوم ہوا کہ اس نے یہ تحریر کر دیا کہ فردوسی کے اشعار ہی نہیں رہے ہے۔

جب ایران میں امن قایم ہوا تو شاہ نامہ کے مہیا کرنے کی فکر ہونے لگی اور دو چار ہی برس بعد بہت سی جلدیں تیار ہو گئیں۔ پہلی جلد اسد خاں آشو کی نے اسپین میں تیار کی مگر اس شاہ نامہ میں محمود کے ہجویہ اشعار اور رستم و سہراب کی داستان بہم نہ پہنچ سکی۔ دوبارہ اس کے چند سال بعد بغداد میں اس کی کئی جلدیں تیار ہوئیں۔ اس میں رستم و افراسیاب اور سکندر کا پورا حال ندارد تھا ہاں دو ہزار اشعار جو فردوسی نے بغداد کے ذکر میں تصنیف کئے تھے زیادہ کئے اور اس کی ترتیب خلیفہ کے حکم سے صمد بغدادی۔ آغا زحسن اصفہانی اور چند ایرانیوں نے کی تھی۔ غرض اسی طرح ایران کے مختلف حصص میں شاہ نامے

تیار ہوتے رہے اور ان میں صرف یہی فرق رہا کہ کسی میں، تو کوئی قصہ بڑھ گیا اور کسی میں گھٹ گیا۔

دہلی میں شاہ عالم کے وقت میں یہ کوشش کی گئی تھی۔ کہ سب شاہ ناموں کو جمع کر کے ایک شاہ نامہ مکمل تیار ہو جائے۔ لیکن غلام قادر کی بے اعتدالی سے دل کے دل ہی میں یہ ارادہ رہگیا۔ مگر اس کا شرف لکھنؤ کے لئے لکھا تھا نصیر الدین حیدر نواب اودھ نے خود ہی بغیر کسی کی تحریک کے اس طرف توجہ فرمائی اور اس اختلاف کو اٹھانا چاہا۔ اور ایک حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اکثر نسخے شاہ نامے کے جمع کئے گئے اور ان سے ایک مکمل نسخہ مرتب ہوا ان نسخوں میں پہلا نسخہ مولانا عبد الرحیم بن مولانا عبد اللہ القرشی کے ہاتھ کا ایرانی خط میں لکھا ہوا تھا۔ اس شاہ نامے میں ۵۱۲۴۳ ابیات تھیں۔ اس پر سنہ ۱۰۲۱ھ لکھے ہوئے تھے۔ نہایت ہی خوش خط تھا اور ہر صفحہ پر سنہری کام نہایت نفاست سے ہو رہا تھا۔

دوسرا نسخہ محمد حافظ رہتکی کے ہاتھ کا نفیس اور خوشنما خط میں لکھا ہوا تھا۔ اس میں کل ابیات ۵۲۰۷۴ پائی گئیں۔ اس پر سنہ ۱۰۰۸ ہجری مرقوم تھا۔ صحت میں اس کا نمبر اچھا تھا۔ غلطی کہیں بھی نہ معلوم ہوئی۔ یہاں تک یہ کہ سکتے ہیں کہ ایک نقطہ کی بھی غلطی نہ تھی۔

تیسرا نسخہ خط نسخ میں دستیاب ہوا خاص بخد کا لکھا ہوا تھا۔ اس کے لکھنے میں بھی صحت کی پوری احتیاط کی گئی تھی۔ اس شاہ نامہ میں ۵۰۵۰۰ ابیات تھیں آخر میں سنہ ۸۸۲ ہجری تحریر تھے۔

چوتھا نسخہ خط ایران میں ملا لیکن پہلے نسخہ کی طرح یہ صحیح نہ تھا اور اس میں ۵۴۴۲۵ اشعار تھے۔ گو خط نہایت پختہ اور باقاعدہ تھا لیکن اکثر جگہ غلطیاں بہت تھیں اور بعض جگہ تو مصرعے ہی بدلے ہوئے پائے گئے شاید تیز طبع کاتب نے اپنی لیاقت کے موافق اس میں اصلاح دی تھی جس سے صاف کھلتا تھا کہ ایک مصرعہ فردوسی

کا ہے اور دوسرا چسپاں کیا ہوا ہے۔ تاہم یہ کہ سکتے ہیں کہ فردوسی کا رنگ نہیں گیا تھا اور ایسی بدعت اس کی بعض بعض شعروں میں ہوئی تھی۔ اکثر اشعار اس انوکھی اصلاح یا ترمیم سے مبرّا تھے ۔

پانچواں نسخہ سیّد التفاف حسین کا جمع کیا ہوا ملا جو انہوں نے بہت محنت سے جمع کیا تھا۔ یہ خط النسخ میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا کاتب حاجی علی المشہور بکاتب تھا۔ جس نے شیراز میں قلمبند کیا تھا اور اس پر عالمگیر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس میں ۵۲۱۳۵ ابیات تھیں اور اس پر سنہ ۸۹۹ ہجری مرقوم تھے۔ یہ نسخہ نہایت صحیح دستیاب ہوا تھا کیونکہ حاشیہ پر کہیں کہیں خود عالمگیر کے دست مبارک کا لکھا ہوا نصیر الدین حیدر نے ملاحظہ کیا۔ یہ نہایت عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ دو وجہ سے یہ شاہنامہ خاص نصیر الدین حیدر کے پاس رہتا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ایک شہنشاہ کے ہاتھوں میں رہ چکا تھا جس کے ایک زمانہ میں ان کے باپ دادا صوبہ دار تھے دوسرے یہ نہایت صحیح اور خوشخط لکھا ہوا تھا ۔

چھٹا نسخہ حاجی محمد قاسم اصفہانی کا جمع کیا ہوا دستیاب ہوا۔ یہ نسخہ اصفہان ہی میں خط ایرانی میں لکھا گیا اور سعید کاتب نے اس کو تحریر کیا۔ اس نسخہ میں گو صحت کا احتمال بہت کچھ کیا گیا ہے مگر پھر بھی کہیں کہیں غلطی رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس کی عمدگی اور معتبر ہونے میں شک نہیں۔ اس میں ۴۹۷۸۲ ابیات تھیں اور سنہ ۹۸۱ ہجری مرقوم تھے ۔

ساتواں نسخہ دومۃ الکبریٰ کا لکھا ہوا مجرہ قرطاس پہ پایا گیا۔ اس نسخہ کی عمدگی نہ صرف اس کی صحت اور خوشخطی پر منحصر تھی بلکہ حاشیہ پر یہ بھی تحریر تھا کہ فلاں سنہ میں فردوسی نے اتنے اشعار کہے اور فلاں سال اس قدر۔ اس نسخہ میں کل ۴۴۲۹۵ ابیات تھیں اور سنہ ۷۲۰ ہجری تحریر تھی۔ اور اس پر شاہ اجی ڈنگ فیلنگ کی مہر لگی ہوئی تھی ۔

آٹھواں نسخہ رکٹس صاحب سے وصول ہوا تھا جو ایرانی خط میں تحریر تھا اور مشہور

خوشنویس عبدالصمد بن علی محمد الحسینی نے اسے لکھا تھا جیسا اس کا خط پاکیزہ تھا ایسی ہی اس کی صحت خوشنما تھی - اس میں ۴۶۹۸۲ ابیات تھیں - آخر میں سنہ ۸۲۰ ہجری مرقوم تھے یہ نسخہ بھی نہایت معتبر سمجھا گیا تھا +

نواں نسخہ بھی منتظم الدولہ ہی نے بھیجا تھا یہ ایرانی خط میں نہایت صحیح اور پاکیزہ لکھا ہوا تھا خط کی عمدگی صحیح ہونے سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی - ہر لفظ میں موتی پروئے ہوئے معلوم ہوتے تھے - اس میں ۵۵۱۹۲ ابیات تھیں - اس پر ۸۹۱ سنہ ہجری مرقوم تھے +

دسواں نسخہ منتظم الدولہ ہی نے بھیجا تھا - یہ دوسرا نسخہ ہندوستانی خط میں تحریر تھا - خط اور صحت دونوں متوسط المرتبہ تھے - یہ دو نسخے جن کو نواں اور دسواں لکھا ہے بڑی تلاش کے بعد منتظم الدولہ نے مہیا کئے تھے اور انہوں نے نہایت شوق سے نصیر الدین حیدر کی خدمت میں روانہ کئے تاکہ تکمیل شاہنامہ میں مدد دے سکیں +

گیارہواں نسخہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی یعنے گروہ فضلا متجسسین علوم و رسوم مشرقیہ سے دستیاب ہوا تھا - نظام بن محمد شیرازی اس کا محرر تھا - ایرانی خط میں نہایت تکلف کے ساتھ لکھا گیا تھا - اسے شاہ ناموں کی عروس کہہ سکتے ہیں - اس میں ۵۱۱۳۳ ابیات تھیں اور اس پر ۸۹۹ سنہ ہجری تحریر تھے +

بارہواں نسخہ ڈنٹین صاحب نے تحفتاً نصیر الدین حیدر کی خدمت میں روانہ کیا تھا - ابن حسن نورالدین اصفہانی نے شیراز میں لکھا تھا صحت و اعتماد میں متوسط الحال - اس میں ۵۲۹۱۱ ابیات تھیں اور آخر میں ۱۰۱۸ سنہ ہجری مرقوم تھے +

تیرھواں نسخہ خط ہندوستانی میں دستیاب ہوا جو ہندوستان کی طرح بوسیدہ اور کہنہ تھا اس میں ۵۰۸۲۴ ابیات تھیں اور اختتام پر ۱۰۰۳ سنہ ہجری مرقوم تھے +

چودھواں نسخہ راہس صاحب نے تحفتاً نواب صاحب کو ارسال کیا تھا۔ یہ ہندوستانی خط میں لکھا ہوا تھا اس کا کاتب عبدالکریم بن عبدالنبی جونپوری تھا۔ جیسا یہ خوش خط تھا اسی قدر صحت اور اعتبار میں بھی خوشنما لگتا تھا۔ اس میں ۱۴۱۷۸۴ ابیات تھیں اور آخر میں سنہ ۱۰۲۰ ہجری تحریر تھے۔

پندرھواں نسخہ ملسٹر صاحب نے نواب صاحب کو بھیجا تھا۔ اس میں ایک لاکھ ابیات تھیں اور اس کی ابتدا گشتاسب نامہ اسدی سے ہوئی تھی۔ اس کا خط بھی نہایت ہی نفیس تھا اور صحت کا انتظام بھی بخوبی کیا گیا تھا۔ اس پر سنہ ۹۹۹ ہجری مرقوم تھے۔

سولھواں نسخہ ببر جنگ کا جمع کیا ہوا ایرانی خط میں دستیاب ہوا یہ اپنی خوشخطی کے ساتھ قابل اعتبار بھی بہت بڑا تھا۔ اس میں ۵۶۵۸۸ بیتیں مرقوم تھیں۔ سال اختتام سنہ ۸۸۱ ہجری تھے۔

سترھواں نسخہ نوشتہ محمد خاں قزوینی نہایت خوشخط قابل اعتماد دستیاب ہوا اس میں ۵۴۰۲۰ ابیات تھیں۔ یہ خط ایران میں لکھا ہوا تھا۔ لیکن خوش خط ایسا تھا کہ کوئی نسخہ اس سے لگا نہ کھاتا تھا۔ اس پر سنہ ۹۱۰ ہجری مرقوم تھے۔

اٹھارہواں نسخہ ایرانی خط میں۔ صحت و اعتماد میں نہایت وقعت کے قابل۔ ابیات ۸۷۹۱۱ جس میں بغداد کی تعریف کی سات ہزار ابیات بڑھی ہوئی تھیں۔ اور یوسف و زلیخا کے قصے کا بھی کچھ حصہ اس میں مرقوم تھا (سنہ ۸۱۰ھ)

انیسواں نسخہ ایرانی خط۔ کیکاؤس کی حکمرانی کی ابتدا سے لہراسپ کی سلطنت تک۔ اپنی صحت اور اعتبار میں یہ اور نسخوں سے بہتر تھا۔ اس پر سنہ ۱۰۱۱ھ لکھے ہوئے تھے۔

بیسواں نسخہ میرزا علی نے بھیجا تھا جو خط غیر ایرانی میں مرقوم تھا۔ اس میں ابتدائے کتاب سے ہیجر کا نام کیخسرو سے لیکر گودرز کے پاس آنے تک۔ کا ذکر تھا صحت

میں لاثانی اعتبار میں وقعت کے قابل سنہ ۹۱۰ ہجری مرقوم تھے ٭
اکیسواں نسخہ میں شاہنامہ کی ابتدا سے کیخسرو کے غائب ہونے تک کا حال ہے
صحت اور خط وتو نہایت قابل تعریف ٭
بائیسواں نسخہ آنریبل مسٹر ملول صاحب نے نواب صاحب کو تحفتاً دیا تھا۔ اس میں
سوسن رامشگر کے قصہ سے آخر تک بیان ہے۔ جب ان نسخوں پر نظر کی گئی تو بہت
بڑا اختلاف اشعار میں پایا۔ چونکہ یہ کل نسخے بلکہ اس سے بھی دو چند زیادہ نصیرالدین
شاہ والئے ایران کے طہرانی کتب خانہ میں نظر سے گذر چکے ہیں اس لئے میں ان کی
بابت کچھ تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ ایرانی نسخوں سے ہندوستانی نسخے کبھی زیادہ اعتبار
کے قابل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شاہنامہ کا مخزن خاص ایرانی سرزمین تھی پھر یہ کیونکر
ہوسکتا ہے۔ کہ ہم ہندوستانی نسخوں کو ان کے مقابل میں اعتبار کے قابل سمجھ
لیں۔ چنانچہ ایک نسخہ میں یہ شعر تحریر ہے ٭

چراغیست مرتیرہ شب راپسیچ
بہ بدتا توانی تو ہرگز مپیچ

اب اگر اس شعر کی نوعیت پر خیال کرتے ہیں تو ایک مصرعہ کو دوسرے سے کچھ مناسبت
نہیں معلوم ہوتی۔ مگر چو بیس نسخوں میں اسی طرح اس شعر کو لکھا ہوا دیکھا ہے اس لئے
مجبوراً ہم بھی اس پر کچھ ریمارک نہیں کرتے۔ جب بہت کچھ تلاش کیا تو ایک نسخہ
میں یہ بیت لکھی ہوئی تھی ٭

چراغیست مرتیرہ شب راپسیچ
نہ بینی تو اندر نہادش مپیچ

یہ شعر نہایت بامعنے اور روشن تر ہے پہلے شعر سے اس میں زیادہ صفائی اور اس
کے معنے صریح ہیں لیکن سوائے ایک قلمی نسخہ کے دوسرے میں دیکھنے میں نہیں آیا
اگر ہم موجودہ مطبوعہ شاہنامہ پر ایک نظر ڈالینگے تو اکثر مقام سے یہ پایا جائیگا کہ فردوسی
کی گویا زبان ہی یہ نہیں ہے اور دوسرے شخص کی تصنیف سے ہے۔ مثلاً قصہ

جمشید گورنگ شاہ کی بیٹی کے ساتھ صرف دو نسخوں میں ملا۔ اس قصہ کی بیتیں رزم بزم اور سوز و گداز میں شاہ نامہ کی اور ابیات سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ لیکن گشتاسپ نامہ اسدی میں لکھی ہوئی ہیں اور اکثر صاحبان تذکرہ مثل لطف علیخاں آذر آتشکدہ دولت شاہ و علی قلی خاں وغیرہ وغیرہ نے اس داستاں کی اکثر بیتوں کو اسدی کی طرف منسوب کیا ہے۔ دوسری حکایت جس میں رستم اور کگ کی جنگ کا بیان ہے ایک نسخہ میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہاں ایک نسخہ میں صرف یہ داستان دیکھی گئی۔ ہم کسی طرح ان اشعار کو فردوسی کا نہیں سمجھ سکتے۔ نہ وہ فصاحت ہے نہ بلاغت ہے نہ بندش ہے نہ برجستگی ہے نہ پرمغزی ہے۔ یہ اشعار فردوسی کے اصل اشعار سے کسی ایک صفت میں بھی کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ مثلاً مفصلہ ذیل اشعار سے معلوم ہو گا کہ فردوسی اس بندش سے بہت دور تھا۔

زبیں ہست کوہست و شتست مہیست	ز نسناس از آدمی پا پر پیست
چو بشنید میلاد و افگند سر	بہ پیشش نمیکرد برد نے نظر
نہ مرد لیست این نزدی و نہ زنی	بدیں کار دو الپس ہنر مہر نی
چو زاں قلہ ود و ثرا ثرو انحا نہ	روانگشت زال و از انجا نماند

جنہیں فارسی زبان سے کچھ بھی مذاق ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اشعار اور ان کا ناموزون اور بے مزا جوڑ فردوسی کا ہرگز نہیں ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر فردوسی کا اس پر پچھاواں بھی پڑجاتا تو یہ مہمل پن ان میں نہ رہتا۔ نہ فصاحت ہے نہ بندش درست ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کسی نے منہ چڑایا ہو۔

دوسری حکایت جس میں کگ کا تذکرہ ہے اس کے اشعار بھی فردوسی کے خاک مقابلہ کے نہیں ہیں۔ اول تو لفظ کگ خبر نہیں کیا معنے رکھتا ہے۔ اور کس زبان کا ہے۔ کیونکر فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع میں کہیں اس کا پتہ نہیں۔

فردوسی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ایک بے معنے بات اپنی عالی شان کتاب میں بیان کردیگا اور پھر اس کی تشریح نہ کریگا۔ تیسری حکایت یہ بیان ہوئی ہے کہ نوذر کے مرنے کے بعد جب افراسیاب نے ایران پر لشکر کشی کی تو بزرگان ایران نے زال سے استمداد چاہی۔ زال نے اپنی ضعیفی کا عذر پیش کیا میں اس عمر میں افراسیاب کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کا عذر اس نیچے لکھی ہوئی بیت میں بیان ہوا ہے ؎

کنوں چنبری گشت پشت یلی
نتابد ہمے خنجر کابلی

اس کے بعد اس نے رستم کو سپہ سالار مقرر کیا لیکن رستم کی ناتجربہ کاری اور بچپن سے خوف کھاتا تھا کہیں یہ اپنی نوجوانی کی ترنگ میں اپنی جان نہ دیدے۔ جب رستم نے یہ دیکھا کہ میرا باپ میرے بچپن اور ساتھ ہی میری ناتجربکاری سے ڈرتا ہے تو اس نے گذشتہ جنگ عظیم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جنگ عظیم جس میں رستم کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ جس کا بیان نیچے لکھے ہوئے اشعار میں کیا گیا ہے ؎

ہمانا فراموش کردی ز من	دلیری نمودی بہر انجمن
ز کوہ سپید و ز پیل دمان	کمانم کہ آگاہ بد پہلواں

شاہ نامہ موجودہ میں جو الحاقی حصہ ہے اس میں شک نہیں کہ اصل اور الحاق میں بہت بڑا فرق ہے۔ تاہم نصیر الدین حیدر نواب اودھ نے ان تمام شاہ ناموں سے ایک شاہ نامہ کی ترتیب دلوائی وہی شاہ نامہ چھپا ہوا ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اور فاضل ترتیب دینے والے نے یہ کمال کیا ہے۔ کہ وہ حکائتیں جو اکثر میں نہیں ہیں اور ایک آدھ میں ہیں انہیں الحاقی کردیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ الحاقی حصہ اپنی شائستگی میں اصل سے بہت گرا ہوا ہے ؎

غرض یہ بہت بڑے شکر کا مقام ہے کہ ہمیں منشی نولکشور کے مطبع کی بدولت پرانی کتابیں کہ جو ہزاروں روپیہ خرچ کرتے کے بعد بھی نہ ملتیں نہایت کم قیمت میں ترتیب دی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ اختلاف نصیر الدین حیدر نے واقعی بہت بڑی مدت کا مٹایا ورنہ اب تک جتنے شاہ نامے طبع ہوئے ان میں ایک نہ ایک حصہ کم ہوتا تھا۔ مگر اب جس جگہ شاہ نامے تیار ہوئے ہوئے ہیں یکساں ہوتے ہیں ۱۸۲۹ء میں جو شاہ نامہ کلکتہ میں طبع ہوا تھا اس کی بھی نولکشوری شاہ نامہ سے ہو بہو نسبت تھی اور دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے +

شاہ نامہ اور سکندر نامہ نظامی

شاہ نامہ محض اپنی پرزور اور زبردست نظم سے یادگار زمانہ نہیں ہے بلکہ پرانے دو ہزار برس کے حالات اپنے میں رکھنے سے بھی دیرینہ واقعات کا مخزن ہے۔ جو کچھ فردوسی نے اس میں بیان کیا ہے وہ مبالغہ سے بہت خالی ہے گو اس کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ بعض جگہ مبالغہ ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی ضرور یقین کرنا پڑیگا کہ وہ نظامی کی طرح مبالغہ کو اپنا زیور سخن نہ سمجھتا تھا۔ نہ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک مبالغہ ہوگا شعر کا لطف نہ آئیگا۔ اسے اپنے پرزور الفاظ اور عجیب و غریب نشست پر بہت بڑا فخر تھا اور وہ جانتا تھا کہ میرے کلام میں بہت بڑا اثر ہے۔ جس واقعہ کی بلا مبالغہ تصویر کھینچونگا اس کو ایسا ثابت کرکے دکھادونگا گویا یہ ہو رہا ہے۔ فردوسی نے ہر جگہ یہی التزام کیا ہے اور ہر جگہ اس کی لاثانی شاعرانہ قابلیت اس سے ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایسے الفاظ کم لایا ہے کہ جو رنگینی بڑھاکر عبارات کو فوق البھڑک بنا دیتے ہیں۔ مگر ایک نکتہ چین نظر ضرور ان میں کامیاب ہوکر اس دھوکا دہ پوشاک کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دیتی ہے اور بار بار ایسی عبارت سے وہ یوں گویا ہوتی ہے +

بزیر عمامہ نہاں کردۂ برص لیکن
بچشم اہل بصیرت برہنہ مے آئی

فردوسی ہمیشہ سیدھے اور سادے الفاظ لانے کی کوشش کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی بے مثال شاعری ان بھدے اور فوق البھڑک الفاظ سے بہت دور ہے۔ وہ پر مغز الفاظ لاکر ان میں نشست اور برجستہ مطالب کی نئی روح پھونکنا چاہتا ہے اور حتی الوسع رنگین بھڑک بھڑک الفاظ سے بہت دور رکھنا چاہتا ہے ٭

مگر نظامی میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ چمکیلے اور بھڑکیلے الفاظ لاکر عبارت کو پر مغز بناؤں۔ گو نظامی اپنی اس کوشش میں کہیں کہیں کامیاب ہوا ہے لیکن اکثر مقام پر یہ کوشش محض نا شدنی معلوم ہوئی۔ برجستگی عبارت اور الفاظ کی نشستگی تو اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن کمبخت آورد نے کہیں کہیں سے اس کی ہیوٹی پر تاخت و تاراج کر کے اس حسن کو جو فاضل نظامی۔ الفاظ کے تن میں روح کی طرح پھونکنا چاہتا تھا ملیا میٹ کر دیا اور نظر بازوں کی نگاہ میں یہ بات کھٹکنے لگی کہ نہایت کھینچ تان کر یہ اشعار موزوں کئے گئے ہیں ٭

ہم چند مقام مختلف طرح کے دونوں فاضل شاعروں کی کتابوں سے خلاصہ کرتے ہیں جس سے خود اندازہ ہو جائیگا کہ زیادہ نیکٹس یعنے صحیح صحیح باتیں کس کی نظم میں ہیں اور مبالغہ کس کی شاعری میں زیادہ ہے۔ نظامی اپنے ممدوح نصرۃ الدین کی تعریف کرتا ہے ٭

سکندر شکوہے کہ در جملہ ساز	شکوہ سکندر بدو گشت باز
زمیں زندہ دار آسمان زندہ کن	جہانگیر و دشمن پراگندہ کن
طرفدار مغرب بمردانگی	قدر خان مشرق بفرزانگی
جہاں پہلواں نصرۃ الدیں کہ ہست	براعدائے خود چوں فلک چیرہ دست
مخالف پس اندیشہ او پیش بیں	بداندیش کم مہر او بیش کیں
خداوند شمشیر و تخت و کلاہ	سہ نوبت زن و پنج نوبت پناہ

برستم رکابے رواں کرد رخش | ہم اورنگ پیرائے ہم تاج بخش
شہاں راکہ رسمے کہ آئیں بود | کلید آہنیں گنج زریں بود
جزاو کاہن تیغ روشن کند | کلید آرزو گنج زاہن کند
چو آب فرات آشکارا نواز | چو سرچشمۂ نیل پنہاں گداز
اگر سایہ بر آفتاب افگند | دراں چشمۂ آتش آب افگند
اگر ماہ نورا براتے دہد | زنقص کمالش نجاتے دہد
گر انعام آں برشمارد کسے | بداں تا کند شکر نعمت بسے
زشکر دے آں نعمت افزوں بود | ملے نعمتے بیش ازیں چوں بود
فلک وار ہر ہر کہ بندد کمر | بر آب افگند چوں زمینش سپر
بریزد در آشوب چوں میغ او | سر تیغ او از سر تیغ او
ہر انچہ سہ او نمودہ او گہ کارزار | نہ رستم نمودہ نہ اسفندیار
صلاح جہاں آں شب آمد بدید | کہ از مولدش صبح صلوق دمید
کجا گام زو جنگ پدرام او | زمیں یافت سرسبزی از گام او
بہر دایرۂ کو زدے ترک و تاج | زپرکار خطش گرہ کردہ باز
بداں بقعہ کو بارگی تاختہ | زمیں گنج قاروں بر انداختہ
براں ذژ کہ او رایت انگیختہ | سرکوتوال از دژ آویختہ

اسی طرح بہت دور تک نظامی نے اپنے ممدوح کی صفت وثنا کی ہے اگر ہم اپنے دل میں صرف یہ خیال کرلیں کہ مشرقی شعرا کا یہ مذاق ہی ہے کہ سوائے جھوٹ کے تودۂ طوفان باندھنے کے اور کچھ اصلیت سے غرض ہی نہ رکھتے تو تو ہمیں خاموش ہو جانا چاہیئے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرا شاعر موجود ہے کہ جو اس سے بہت پہلے زمانہ کا ہے اور جس نے اس بے بنیاد مبالغہ کو ناپسند کیا ہے تو از خود دانائے طوس کی صفت وثنا کرنے پر طبیعت مایل ہوئی ہے۔ سکندر شکوہ نظامی نصرۃ الدین کو کہتے ہیں اگر وہ ذرا بھی غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ سکندر

کے ایک صوبہ کے گورنر کے برابر بھی نصرۃ الدین درجہ نہیں رکھتا +

پھر زمین زندہ دار اور آسمان زندہ کن اور بھی بے معنے مبالغہ ہے کہ جس کا ٹھکانا نہیں۔ پھر چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں یہ لکھتے ہیں براعدائے خود چوں فلک چیرہ دست اس کا درجہ اصل مبالغہ سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ بظاہر اپنے ممدوح کو فلک سے تشبیہ دینی اور ایک خاص صفت میں اس کی مثال ٹھہرانا مدح نہیں بلکہ ہجو ہے۔ یہ تمام مشرقی شعرا کا مذہب ہے کہ فلک مکار غدار۔ فتنہ ساز اور ظالم بیرحم ستمگار ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ دہوکا دیکر مارتا ہے۔ وہ خود کسی کا دوست نہیں بلکہ ہر شخص اس کی صورت دیکھا کرتا ہے اور اس کی مہربانی کا امیدوار رہتا ہے۔ فلک کا درحقیقت کوئی بھی دشمن نہیں مگر فلک ہی سب کا دشمن ہے۔ ایسے ظالم سے اپنے ممدوح کو خواہ کسی خاص صفت ہی میں کیوں نہ سہی نسبت دینا سخت قہر آلود ہے +

پھر دسویں شعر میں یہ مصرعہ "چو آب فرات آشکارا نواز" اگر نظامی کو یہ معلوم ہوجاتا کہ آب فرات ہمیشہ گدلا رہتا ہے تو وہ کبھی اپنے ممدوح کو اس سے نہ جا بھڑاتے اور نیز اگر یہ معلوم ہوتا کہ حضرت امام حسین شہید کربلائے پر آب فرات بند تھا تو ہرگز اپنے ممدوح سے اس کی تشبیہ نہ دیتے۔ اگر فرات کی جگہ لفظ دریا عام ہوتا تو کچھ آشکارا نوازی کی صفت ہونے میں خلل نہ پڑتا۔ لیکن جب فرات ایک خاص دریا کا نام آگیا تو ضرور آشکارا نوازی کی صفت اسی کے لئے خاص ہوگئی اور اور دریا اس سے محروم رہگئے۔ ہمارا یہ اعتراض خواہ کیسا ہی رکیک کیوں نہ ہو پھر بھی ایک بڑا عیب فاضل شاعر کے شعر میں ثابت ہوتا ہے جو کبھی نہیں جاسکتا +

پھر گیارہواں شعر قابل ملاحظہ ہے ؎

اگر سایہ بر آفتاب افگند

دراں چشمہ آتش آب افگند

اس شعر میں الفاظ کی نشست تو اس غضب کی ہے کہ اگر مطالب پر نہ خیال کرو تو یہ

معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر اس فطرت کا شعر کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر جب اس کے مطالب پر نظر کی جاتی ہے تو محض بے معنے معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ آفتاب کی روشنی دنیا کی زندگی کی باعث ہے۔ آدمی ہو خواہ جانور خواہ پرند بغیر اس کی روشنی کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ تو نظامی کے ممدوح کے سایہ میں یہ زبردست ظالمانہ صفت ہے کہ اگر چاہے تو اپنے خنک سایہ سے روشنی کے اس سرچشمہ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے کہ جو باعث حیات مخلوق باری تعالےٰ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کے یہ معنے نہیں ہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ چشمہ آتش میں آب ڈالنا گویا اسے شرمندگی کے مارے پانی پانی کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ سایہ میں صرف وہ روشنی ہے تو چشمہ آفتاب آتا نہ کہ چشمہ آتش۔ جب چشمہ آتش آیا اور اس پر پانی کا گرنا بیان کیا گیا ہے تو ضرور آگ کے بجھنے سے غرض ہے اور یہ محض جنوں ماب خیال ہے +

پھر بارہواں شعر دیکھا جائے ؎

اگر ماہ نور ا برا فشاندے دہد
ز نقص کمالش نجاتے دہد

اگر اصل پوچھو تو چاند میں نقص ہوتا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ یکساں حالت میں رہتا ہے۔ یہ ہماری نظروں کا نقص ہے کہ وہ ہمیں گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے۔ کاش اگر نظامی اس جگہ یہ بیان کرتے کہ اگر میرا ممدوح چاہے تو نگاہوں میں وہ قدرت اور تیزی دے سکتا ہے کہ جو چیز کامل چاند دیکھنے کے لئے ہمارے آگے حائل ہو جاتی ہے اس کو بھی چیر کر نکل جائے تو بیشک لطیف معنے پیدا ہو جاتے اور پھر مبالغہ کی بھی شان اس سے نہ بڑھتی جو اس شعر میں موجود ہے +

زیادہ میں ہر شعر پر ریمارک کرنا نہیں چاہتا نہ میری غرض نظامی کے معائب ظاہر کرنے سے ہے۔ چونکہ مجھے خیالات اور شاعرانہ قابلیت کا مقابلہ کرنا۔ اور دکھانا ہے کہ فردوسی اور نظامی میں نیچرل شاعری کا رنگ کس درجہ تک ہے اور ان دو فاضل شعرا نے کیا کیا موتی پروئے ہیں۔ ورنہ اس کے علاوہ نظامی وہ شاعر ہے

کہ جس کے نام ہی لینے سے شاعری میں جان پڑتی ہے اور مشرقی شاعری کا ایک بہت بڑا رکن ہے۔ مقابلہ دوسری چیز ہے اور علیحدہ علیحدہ ایک ایک کی لیاقت کو جانچنا دوسرا امر ہے۔ چنانچہ فردوسی اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہے +

ز یزداں بر شاہ بد آفریں   کہ نازد برو تخت و تاج و نگیں

خداوند تاج و خداوند گنج   خداوند شمشیر و خفتان و رنج

کہ گنجش ز بخشش بنالد ہمی   بزرگی ز نامش ببالد ہمی

ز دریا بدریا سپاہ و سیت   جہاں زیر فر کلاہ و بیست

ز دشمن ستاند رساند بدوست   خداوند پیروز گر یار اوست

ببزم اندروں گنج بر اگند   چو رزم آیدش شیر و فیل افگند

چو او مرز گیرد بشمشیر تیز   بر انگیزد اندر جہاں رستخیز

ازاں دست و آں تیغ گوہر فشاں   زگیتی بجوید ہمے جز نشاں

کہ در بزم دریاش خواند سپہر   برزم اندروں شیر خورشید چہر

گواہی دہد در جہاں خاک و آب   ہماں بر فلک چشمہ آفتاب

کہ چوں او نبود ست شاہے بجنگ   نہ در بخشش و کوشش و نام و ننگ

اگر مہر با کیں نیامیز دے   ستارہ ز چشمش فرو ریزدے

تنش زور مند ست چندیں سپاہ   کہ اندر میاں باد را نیست راہ

پس لشکرش ہفتصد ژندہ پیل   خدائے جہاں یاور و جبرئیل

ہمے باژ خواہد ز ہر مہترے   ز ہر نامدارے و ہر کشورے

اگر باژ ندہند و کشور دہند   ہماں گنج و ہم تخت و افسر دہند

کہ یارد گذشتن ز پیمان او   دگر سر کشیدن ز فرمان او

کہ در بزم گیتی بدو روشن ست   برزم اندروں کوہ در جوشن است

ابو القاسم آں شہریار دلیر   کجا گور بستاند از چنگ شیر

جہاندار محمود کاندر نبرد   سر سرکشاں اندر آرد بگرد

جہاں تا جہاں باشد او شاہ باد ‏ ‏ بلند اخترش افسر ماہ باد
کہ آرایش چرخ گردندہ اوست ‏ ‏ ببزم اندروں ابر بخشندہ اوست
خرد ہست و ہم نیکنامی و داد ‏ ‏ جہاں بے سر و افسر او مباد
سپاہ و دل و گنج و دستور ہست ‏ ‏ ہماں رزم و بزم ہماں شور ہست
یکے فرش گسترده شد در جہاں ‏ ‏ کہ ہرگز نشانش نگردد نہاں
کجا فرش را مسند و مرقد است ‏ ‏ نشستنگہ فضل بن احمد است
بند خسرواں را چناں کد خدائے ‏ ‏ بپرہیز و داد و بدین و برائے
کہ آرام این پادشاہی بدوست ‏ ‏ کہ او بر سر نامداراں نکوست
کشادہ زبان و دل و پاک دست ‏ ‏ پرستندۂ شاہ یزداں پرست

ان اشعار میں صرف دو تین ابیات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ہم ان کی اندرونی فطرت پر خیال کرینگے تو معلوم ہوگا کہ در اصل وہ بے ڈھنگا اور بے معنے مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر زبان کا محاورہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ عام کہکر خاص مراد لیا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر یہ ہے "گواہی دہد در جہاں خاک و آب۔ جہاں بر فلک چشمۂ آفتاب"۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں جہاں میں خاک و آب کا گواہی دینا کہ محمود کی طرح کوئی سلطان جنگ میں نامور نہ ہوا اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ بیشک محمود نے مغرور راجپوتوں سے بڑے بڑے میدان لئے اور جس جگہ اس نے فتح پائی وہ ہی مقام اس بات کا شاہد ہوگا کہ محمود کو یہاں فتح حاصل ہوئی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں بادی النظر میں بہت بڑا مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ مبالغہ خالی از لطف نہیں ہے۔ آفتاب کی روشنی ہی میں کل کام ہوتے ہیں۔ جنگ کے موقع پر آفتاب کی موجوگی خود فتح و شکست کی گواہ بن سکتی ہے۔ پھر دوسرے شعر میں صریح مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے "اگر مہر باکین نیا میزدے۔ ستارہ ز خشمش فرو ریزدے"۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ بہت بڑا مبالغہ ہے لیکن ایسا لطیف مبالغہ ہے کہ آج تک کسی شاعر کو نصیب

ہی نہیں ہوا۔ مادہ شہاب ثاقبی کا اٹھنا سفر یعنے کرۂ باد کی اسٹیج پر ایکٹ کرنا
اور سطح ہوا پر پھول جھڑیاں یا مہتابیاں چھوڑنا ہم لوگوں کی زبان میں ستارہ
کا ٹوٹنا کہلاتا ہے۔ تو فاضل شاعر یہ لکھتا ہے کہ محمود کا غضب اور لطف دونو
ملے ہوئے ہیں غضب کی وجہ سے تو ستارہ اپنی جگہ سے ٹوٹ کر زمین پر گرنا چاہتا ہے
اور جب آتش فشاں آہوں سے وہ جلا وطن ہو کر نئے عالم میں آنا چاہتا ہے تو
اس وقت رحم محمودی کو حرکت ہوتی ہے اور اس پر ترس کھایا جاتا ہے کہ پھر وہ اپنی
جگہ پر چلا جاوے چنانچہ وہ سطح زمین پر نہیں گرتا اور اوپر ہی اوپر غائب ہو جاتا ہے
دوسرا لطف اس شعر میں یہ بھی ہے کہ ستارہ کو ایسی جگہ مثالاً لانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ
مشرقیوں میں عموماً یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ستارہ کی گردش سے تمام برائیاں
ظہور پذیر ہوتی ہیں گو اسلام نے اس مہمل عقیدہ کی دھوم دھام سے تردید کی ہے
بایں ہمہ کروروں غیر اسلام اور بعض بعض اہل اسلام بھی عقیدہ رکھتے ہیں تو ستارہ
کو لوگوں کے ستانے کی یہ سزا دی اور جب وہ سزا پا چکا تو اسے معراج بخشی کر کے
واپس کر دیا۔ یہ تو باریک خیالی کا لطف آیا تیسرے اس میں بہت بڑا کمال یہ ہے کہ
ایک بہت بڑے تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے[1] ملتان کے قریب ایک راجہ
چند قصبوں پر حکومت کرتا تھا اس کا نام ستارہ تھا۔ محمود نے ملتان فتح ہونے
کے بعد اُسے بغیر ایذا دیئے چھوڑ دیا مگر ایک دوسرے موقع پر اس نے محمود کے
خلاف بہت کچھ کوشش کی اور مخالف کی ہر طرح سے مدد کی محمود نے غضبناک ہو کر
ایک دستہ فوج سے اُسے گرفتار کر کے بلوا لیا۔ اور حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر
کنگرۂ قلعہ پر سے نیچے پھینکدو جب لوگ اسے پھینکنے کو لے چلے وہ سخت رو دیا چیخا اور
محمود کو اپنی پناہ بنایا محمود نے فوراً رحم کھا کر اُسے چھوڑ دیا۔

غرض ان تین چار خوبیوں سے جو اس شعر میں ہیں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے
کہ فاضل شاعر نے کیا ستم برپا کیا ہے اور صرف چند الفاظ میں کتنے کتنے

---

[1] ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۴۶۸؂

بڑے مطالب حل کر گیا ہے +

ان دو ایک اشعار کے علاوہ اور کوئی شعر ایسا نہیں ہے کہ جس میں فیکٹ کے سوا کچھ بھی مبالغہ کی جھلکی پائی جائے۔ اس مقابلہ سے خود اندازہ ہو گیا ہوگا کہ نظامی نے اپنے لئے شاعری کا کونسا میدان پسند کیا اور فردوسی نے کونسا پلین اچھا سمجھا +

اب ہم وہ مقام نقل کرتے ہیں جہاں دونوں عظیم الشان شعرا نے پیری کا بیان کیا ہے۔ یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے +

نظامی

چہ گنج است کاں ارمغانیم نیست | دریغا جوانی جوانیم نیست
چو دور افتد از میوہ خور میوہ دار | چہ خرما بود ظل بن راچہ خار
جوانی شد و زندگانی نماند | جہاں گو مماں چوں جوانی نماند
جوانی بود خوبی آدمی | چو خوبی رود کے بود خرمی
چو پے سست و بوسیدہ شد استخواں | دگر قصۂ خوبروئے مخواں
غرور جوانی چو از سر گذشت | ز گستاخ کاری فرو شوے دست
بسی چہرۂ باغ خنداں بود | کہ شمشاد بالا کہ خنداں بود
چو باد خزانی در افتد بباغ | زمانہ دہد جائے بلبل بزاغ
چو برگ ریزاں زشاخ بلند | دل باغباں زاں شود دردمند
ریاحین بستاں شود ناپدید | درباغ راکس نہ جوید کلید
بنالد ہے کہن بلبل سالخورد | کہ رخسارۂ سرخ گل گشت زرد
دوتا شد سہی سرو آراستہ | کہ دیور شد از باغ برخاستہ
چو تاریخ پنجہ درآمد بسال | دگرگونہ شد بر شتابندہ حال
سراز بار سنگی درآمد بسنگ | جمازہ بتنگ آمد از راہ تنگ

فروماند دستم زمے خواستن	گراں گشت پائم زبرخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت	گلم سرخی انداخت زردی گرفت
ہموں رونده ره زه مانده بار	بیا لینگہ آمد سرم را نیاز
ہماں یورچوگانی بادپائے	بصد زخم چوگاں نجنبد زجائے
طرب راکہ خانہ گم شد کلید	نشاں پشیمانی آمد پدید
برآمد زکوه ابر کافور بار	مزاج زمیں گشت کافورخوار
گہے دل برفتن گرایش کند	گہے خواب را سرستایش کند
مرا برف بارید بر پر زاغ	نشاید چو بلبل تماشائے باغ
عتاب عروساں درآمد بگوش	صراحی تہی گشت وساقی خموش
سر از نوح پیچیده گوش از سماع	کہ نزدیک شد کوچگہ را وداع
بوقت چنیں کنج بہتر زکاخ	کہ دوراں کند دست بازی فراخ
تماشائے پروانہ چنداں بود	کہ شمع شب افروز خنداں بود
چو از شمع خالی کنی خانہ را	نہ بینی دگر نقش پروانہ را
بزورجوانی و نونزادگی	زدم لاف پیری و افتادگی
کنوں کے بغم شادمانی کنم	بہ پیرانہ سرچوں جوانی کنم
چو بوسید چوبے کہ در کنج باغ	فرزنده باشد بشب چوں چراغ
شب افروز گرمی کہ تابد نہ دور	زبے نوری شب زند لاف نور
اگر دیدمے درخود افزایشے	طلب کردمے جائے آسایشے
بآسودگی عمر نو کردمے	جہاں را بشادی گرو کردمے
چو زور جوانی بپایاں رسید	سپیده دم از مشرق آمد پدید

بتدبیر آنم کہ سر چوں کشم

جگونہ پے از کار پیری نہم

نظامی نے اس میں شک نہیں کہ زمانہ پیری کا ہو بہو نقشہ کھینچ کر دکھا دیا

کاش اگر وہ ان حسرت ناکامیوں کا بھی جو بڑھاپے میں ہوا کرتی ہیں نقشہ کھینچتے تو دنیا میں مشرقی و مغربی شعرا میں ان کا ثانی نہ نکلتا پھر بھی جو کچھ لکھا ہے وہ انتہا درجہ تعریف کے قابل ہے لطف یہ ہے کہ مبالغہ کا مطلق نام نہیں اور پھر ہر ہر مصرعہ پر سمجھنے والے پر وہ وجد انگیز حالت طاری ہوتی ہے کہ اس کا مزاہ خوب ہی خوب جانتا ہے مثلاً اس شعر میں ؎

جوانی شد و زندگانی نماند
جہاں گو ممان چوں جوانی نماند

نظامی نے زمانہ پیری کا اصلی نتیجہ بیان کردیا ہے۔ یہ اسی شاعر غرا کا کام تھا کہ کن سادے سادے الفاظ میں فطرت کے اس باریک مضمون کو ادا کیا ہے کہ جس میں ہزارہا صفحے سیاہ ہو رہے ہیں ان الفاظ کی سادگی تمام زبانوں کے پرشوکت الفاظ سے اس وقت نمایاں تاباں ہوگئی فصاحت و بلاغت نے ہر ہر لفظ میں جنم لیلیا اور فاضل شاعر نے خصوصاً اس بیان پر قلم توڑ دیا یہی شعر چوٹی کا ہے جس میں پیری کی تمام طولانی اونچ نیچ کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اس شعر کے علاوہ سب اشعار نہایت لطیف پاکیزہ اور فیکٹس سے پر ہیں مگر جو اس میں خوبی ہے اوروں میں اس درجہ دیکھنے میں نہیں آتی اب میں فردوسی کے وہ اشعار درج کرتا ہوں جس میں اس نے اپنی پیری کی شکایت کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ دونوں فاضل شاعر پیری کے بیان میں کیا وزن رکھتے ہیں ؛

فردوسی

چو آمد بنزدیک سر تیغ شصت — مدہ مے کہ از سال شد مرد مست
بجائے عنانم عصا داد سال — پراگندہ شد مال و برگشت حال
ہماں دیدہ بان بر سر کوہسار — نہ بیند ہمی لشکر بے شمار

کشیدن ز دشمن نداند عناں   اگر پیش مژگانش آید سناں
پر از برف شد کوہسار سیاہ   ہمے لشکر از شاہ بیند گناہ
گرانید دو تیر پائے نوند   ہماں شصت بدخواہ کردش بہ بند
سراینده زاد از برگشت سیر   ہمش لحن بلبل ہم آواے شیر
دریغ آں گل و مشک و خوش آب سہی   ہماں تیغ برندۂ پارسی
نگردد ہمی گرد نسرین تذرو   گل ناروں خواہد و شاخ سرد
چو بر داشتم جائے پنجاہ و ہشت   نگیرم بجز یاد تابوت و دشت

پھر دوسری جگہ فردوسی اپنی پیری کی شکایت کرتا ہے جہاں اس نے اور بھی حسرت نصیب نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے کہ جس سے بہتر شاید ہی کوئی کھینچ سکے ۔

چنیں سال بگذاشتم شصت و پنج   بدرویشی و زندگانی و رنج
چو پنج از بر سال شصتم گذشت   بد انساں کہ باد بہاری بدشت
من از شصت و شش مست گشتم چو مست   بجائے عنانم عصا شد بدست
رخ لالہ گوں گشت بر سان راہ   چو کافور شد رنگ ریش سیاہ
ز پیری خم آورد بالائے راست   ہم از نرگساں روشنائی بکاست
بدانگہ کہ بد سال پنجاہ و ہشت   جواں بودم و چوں جوانی گذشت
خروشے شنیدم ز گیتی بلند   کہ اندیشہ شد پیر و من بے گزند

پھر اور دوسری جگہ فاضل شاعر نئے رنگ میں آسمان کو مخاطب بنا کر اپنی پیری کی شکایت کرتا ہے جو قند مکرر کا مزا دیتی ہے ۔

الا اے برآوردہ چرخ بلند   چہ داری بہ پیری مرا مستمند
چو بودم جواں برترم داشتی   بہ پیری مرا خوار بگذاشتی
ہمی زرد گردد گل کامگار   ہمی پرنیاں گردد از رنج خوار
دوتائی شد آں سرو نازاں بباغ   ہماں تیرہ گشت آں فروزاں چراغ
پر از برف شد کوہسار سیاہ   ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ

بکردار مادر بدی تاکنوں — ہمے ریخت باید برنج تو خوں
وفا و خرد نیست نزدیک تو — پراز رنجم از راے تاریک تو
مرا کاش ہرگز نہ پروردئی — چو پرورده بودی نیازدئی
ہر انگہ کزیں تیرگی بگزرم — بگویم جفاہائے تو یاد آورم
بنالم زتو پیش یزدان پاک — خروشاں بسر بر پراگندہ خاک
زپیری مرا تنگدل دید دہر — بمن باز داد از گناہش دو بہر

ایک اور مقام پر فاضل شاعر نے دو تین بیتوں میں پیری کا غمناک نقشہ کھینچا ہے جو اور بھی حسرت ناک ہے جس کو وہ اس طرح زمانہ کی شکایت سے شروع کرتا ہے *

الا اے خریدار مغز سخن — دلت برگسل زیں سراے کہن
کہ او چوں من وچوں تو بسیار دید — نخواہد ہمی با کسے آرمید
اگر شہریارے اگر پیشگار — تو اندر گزاری و او پایدار
چو با رنج باشی چو با تاج وتخت — بباید ت بستن بفرجام رخت
اگر زاہنی چرخ بگزاردت — چو گشتی کہن باز ننوازدت
چو سرو دلارا ے گردد بخم — فروشاں شود برگستان وژم
ہماں چہرۂ ارغواں زعفراں — سبک مردم شاد گردد گراں
نخسپید رواں چونکہ بالا بخفت — تو تنہا بماں زانکہ ہمراہ رفت
اگر شہریارے اگر زیر دست — جز از خاک تیرہ نیابی نشست

ہر شخص بخوبی دونوں فضلا کے شاعرانہ رنگ پیری کو اندازہ کر سکتا ہے میں اس پر کوئی ریمارک کرنا نہیں چاہتا مجھے خوف ہے کہ پھر رائے زنی کا میدان تنگ نہو جائے اب میں فاضل شعرا کی خونریز رزم اور میدان جنگ کا نقشہ کھینچتا ہوں *

نظامی میں تمہید کو دھوم دھام سے اٹھانے کا بڑا ملکہ ہے مگر اکثر جگہ افسوس

سے دیکھا جاتا ہے کہ تمہید ہی کا زور شور معلوم ہوتا ہے اور اصل مطلب ایک ہی شعر میں بیان ہو کر رہجاتا ہے حالانکہ فردوسی کا یہ پیرایہ نہیں ہے وہ جس دھوم سے تمہید اٹھاتا ہے اس سے زیادہ زور شور سے۔ مطلب پر زور دیتا ہے۔ نیچے لکھے ہوے اشعار سے یہ ریمارک کی بخوبی تائید ہو جائیگی جیسے نظامی کہتا ہے *

زروسی بر آمد بنا ورد گاہ — یکے شیر پرطاس روئیں کلاہ
چو کوہے رواں گشتہ بر پشت باد — عجب ہیں کہ برباد کوہ ایستاد
مبارز طلب کرد وجولاں نمود — بنام آوری خویشتن راستود
کہ پرطاسیاں را دریں خام چرم — بپرطاسی من شود پشت گرم
چو تندی کند تندری گوہرم — چو آیم برزم اژدہا پیکرم
پلنگاں درم بر سر کوہسار — نہنگاں خورم بر لب جوئبار
چو شیراں بپرخاش خو کردہ ام — نو چوں روبہاں سینہ پروردہ ام
دہشتم بچنگال و سختم بزور — بحملہ درم پہلوئے نرہ گور
ہمہ خون خامست نوشیدنم — ہمہ چرم خامست پوشیدنم
سنانم تہ پہلو در آید بناف — دروغے نمیگویم اینک مصاف
بیاید یکے لشکر از چین و روم — کہ آتش فرزندہ گرد و زموم
مہنجشاد یزداں بداں رہ نمول — کہ بخشایش آرد بہن روز خوں
ز قلب ملک پیش آں تند باز — بروں رفت جوشن در تر کتاز
بپرخاش گرداں کشادند چنگ — دراں پویہ کردند لختے درنگ
ز شمشیر پرطاسی خشمناک — جوانمرد رومی در آمد بخاک

پندرہ اشعار میں تیرہ اشعار تو صرف تمہید کے ہیں اور دو پر ھیمے الفاظ میں مطلب کا خاتمہ ہو گیا ہے اگر متوسط درجہ کا شاعر میدان کارزار کو اور بہادر دل کی دلیری بیان کرنے کو صرف دو ہی اشعار پر ختم کر دیتا تو اس قدر خیال کی بات

نہ تھی مگر ایسے شاعر کی نسبت تعجب سے نظر کرنا پڑتا ہے کہ جو عالم شاعری میں خدائے سخن کا لقب رکھتا ہے +

تمہیدی اشعار تو میں نے تیس سے بھی زیادہ پیچھے چھوڑ دئیے ہر شخص سکندر اور ردس کی پہلی جنگ میں دیکھ سکتا ہے صرف میں نے اُن ہی اشعار کو لیا ہے جو سپاہی نے اپنی زبان سے اپنی صفت وثنا میں کہے ہیں۔ عموماً مغربی ادیب اور شاعر مشرقیوں پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ لوگ تمہید تو اس زور شور سے اٹھاتے ہیں کہ جس کا ٹھکانا نہیں لیکن جب مطلب بیان کرنے کا وقت آتا ہے تو اس طرح بجھ جاتے ہیں۔ کہ گویا اُن کی طبیعت میں زور ہی نہیں ہے نہ زبان میں وہ قوت رہتی ہے نہ عبارت میں وہ زور نہ الفاظ میں وہ شان کچھ بھی نہیں رہتی یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ بہت دور سے چلے آرہے ہیں اور یہاں آکر ماندہ ہوکر گر پڑے ہیں قریب قریب یہی رنگ نظامی میں پایا جاتا ہے جس سے کیفیت حالی رہتی ہے تمہید کو دیکھ کر دل بہت جوش پر آتا ہے اور لمحہ بلمحہ وہ جوش بڑھتا چلا جاتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ابھی وہ جوش عروج پر نہ پہنچنے پایا تھا کہ اس کا خاتمہ ہوگیا اور ناکام ہو کر راہ ہی میں ٹھیر کر رہگیا فاضل فردوسی کی شاعری اس تمہید سے بالکل مبرا ہے وہ جس داستان کو شروع کرتا ہے تمہید کے شاید ایک دو اشعار ہوتے ہیں ورنہ پوری قوت بیانیہ اس کی اسی میں صرف ہوتی ہے۔ کہ واقعات کو زور دیکر بیان کرے۔ چنانچہ اسی مفہوم کو وہ سہراب اور ہجیر کی جنگ میں ان اشعار میں ادا کرتا ہے کس بلا کی سادگی اور پر مغزی ہے +

فردوسی

چو آگر شد از کار لشکر ہجیر	بپوشید جوشن بکردار شیر
چو سہراب نزدیک آں تر رسید	ہجیر دلاور مر او را بدید
نشمست از بر باد پائے چو گرد	ز روز رفت پویاں بدشت نبرد

بداں لشکر ترک آواز داد — چنیں گفت آں گرد پہلو نژاد

کہ گرداں کدامند جنگ آوراں — دلیران کار آزمودگانِ سراں

کہ با من بگردند دریں کینہ گاہ — ز چندیں دلاور سراں سپاہ

پذیرا نیامد کس او را بجنگ — کہ بد بزر بالاؤ بازور وہنگ

چو سہراب جنگ آور او را بدید — بر آشفت شمشیر کیں بر کشید

ز لشکر بروں تاخت برساں شیر — بہ پیش ہجیر اندر آمد دلیر

چنیں گفت با رزم دیدہ ہجیر — کہ تنہا بجنگ آمدی خیرہ خیر

چرا خیرہ تنہا بجنگ آمدی — خراماں بجنگ نہنگ آمدی

چہ مردی و نام نژاد تو چیست — کہ زائیدہ را بر تو باید گریست

ہجیرش چنیں داد پاسخ کہ بس — بترکی نباید مرا یار کس

منم گرد گیر آں سوار دلیر — کہ روبہ شود نزد من نرہ شیر

ہجیر دلیر سپہبد منم — ہم اکنوں سرت را ز تن بر کنم

فرستم بنزدیک شاہ جہاں — تنت را کنم کرگس اندر نہاں

بخندید سہراب کیں گفتگوے — بگوش آمدش تیز بنہاد روئے

سبک نیزہ بر نیزہ انداختند — کہ از یکدگر باز نشناختند

چو آتش بیامد گوے پیل زور — چو کوہے رواں گرد از جا ستور

یکے نیزہ زد بر میانش ہجیر — نیامد سناں اندر و جائے گیر

سناں باز پس کرد سہراب شیر — بن نیزہ زد بر میانش دلیر

ززیں برگرفتش بکردار باد — نیامد ہمیں زو بدل ورش یاد

بزد بر زمینش چو یکلخت کوہ

بجان و دلش اندر آمد ستوہ

مفہوم اس جگہ نظامی اور فردوسی کا یکساں ہے لیکن طرزِ بیان جدا جدا ہے
نظامی کے بیان میں تمہید ہی تمہید لبالب بھری پڑی ہے اور فردوسی کے اشعار

میں تمہید کے حق کا ایک مصرعہ بھی نہیں ہے +

میں ایک ہی جنگ کے بیان پر قناعت نہ کرونگا بلکہ اور بھی کئی مقام کی مختلف جنگوں کا جو ایک ہی فطرت کی ہونگی مقابلہ کروں گا تاکہ بخوبی ظاہر ہو جائے کہ فردوسی تمہیدی اشعار لانے بہت ہی کم پسند کرتا ہے خواہ جتنا طول طویل بیان کرنا ہو پھر بھی وہ تمہیدی اشعار لانے پسند نہ کریگا۔ گو کہیں کہیں وہ لایا ہے لیکن بہت کم اور اگر ایک آدھ جگہ تمہیدی اشعار ہیں بھی تو انہیں داستان میں شامل نہیں کیا بلکہ انہیں بالکل علیحدہ کر دیا ہے مثلاً سہراب کے قصہ شروع ہونے سے پہلے وہ یہ تمہید لکھتا ہے جو بالکل قصہ سے علیحدہ ہے اور اس میں ملی ہوئی ہے علیحدہ تو یوں ہے کہ ان تمہیدی اشعار کو واقعہ کے اشعار سے کچھ مناسبت نہیں ہے اور شمولیت اس وجہ سے ہے کہ قصہ سہراب میں چونکہ ایک جانگزا جوان موت کا تذکرہ ہے اور وہ بھی باپ کے ہاتھ سے قتل ہونا اور اس تمہید میں موت کی حالت کا فوٹو کھینچا ہوا ہے کہ یہ کسی جوان کو چھوڑتی ہے نہ بچہ کو اس لئے قصہ میں بہت ہی شمولیت کا جزو رکھتی ہے وہ تمہید یہ ہے +

کنوں رزم سہراب رستم شنو	دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو
یکے داستانست پر آب چشم	دل نازک از رستم آید بخشم
اگر تند بادی بر آید ز کنج	بخاک افگند نارسیدہ ترنج
ستمگارہ خوانمش ار داوگر	ہنرمند گویمش ار بے ہنر
اگر مرگ داد است بیداد چیست	ز داد ایں ہمہ بانگ فریاد چیست
ازیں راز جان تو آگاہ نیست	بدیں پردہ اندر ترا راہ نیست
ہمہ تا در آز رفتہ فراز	بکس وا نشد ایں در آز باز
بر فتن مگر بہتر آیدت جائے	چو آرام گیری بدیگر سرائے
اگر مرگ کس را نیوبار دے	نہ پیر و جواں خاک بسیار دے

اگر آتشے گاہ افروختن | بسوزد عجب نیست زو سوختن
بسوزد چو در سوزش آید درست | چو شاخ نو از بیخ کہنہ برست
دم مرگ چوں آتش ہولناک | ندارد ز برناد فرتوت باک
جواں راچہ باید بگیتی طرب | کہ نے مرگ راہست پیری سبب
دریں جائے رفتن نہ جائے درنگ | براسپ قضا گر کشد مرگ تنگ
چناں داں کہ داد ست بیداد نیست | چو داد آمدش بانگ و فریاد چیست
جوانی و پیری بنزد اجل | یکے داں چو در دیں نخواہی خلل
دل از نور ایماں گر آگندہ | ترا خامشی بہ کہ تو بندہ
پرستش ہماں پیشہ کن بانیاز | ہماں کار روز پسیں را بساز
بریں کار یزداں ترا راز نیست | اگر دیو با جانت انباز نیست
بگیتی دراں کوش چوں بگزری | سرانجام اسلام با خود بری

کنوں رزم سہراب گویم درست
ازاں کیں کہ او با پدر چوں بجست

اگر ہم ان تمہیدی اشعار کو نکال ڈالیں تو اس کے قصہ بیان کرنے میں کچھ خلل واقع نہ ہوگا اور جو رہنے دیں تو وہ داستان کی ہیڈنگ پر ایسی بہار دے رہے ہیں کہ جیسے جڑاؤ جھومر دلھن کی پیشانی پر بہار دیتا ہے۔ اس تمہید کے بعد داستان اس شعر سے شروع کرتا ہے :

زگفتار دہقاں یکے داستاں
بپیوندم از گفتہ باستاں

یہ شعر خود ہی شہادت دے رہا ہے کہ یہیں تمہید سے با علاقہ ہونے پر بھی محض بے علاقہ ہوں :

اس کے علاوہ نظامی میں ایک بات اور بھی اکثر جگہ دیکھی جاتی ہے گو بعض مقام پر انھوں نے اس عیب سے پہلو بچایا ہو وہ بات یہ ہے کہ نظامی جب دد

پہلوانوں کی جنگ کا بیان کرتا ہے اور اسے ایک سوار کو غالب کرنی کی صلاح ہوتی ہے تو مغلوب کی نہ کچھ بہادری بیان کرتا ہے نہ اس کے ہنر نہ اس کے جنگ میں چستی۔ مثلاً جہاں رومیوں اور روسیوں کی جنگ کی داستان ہے وہاں نظامی نے اکثر جگہ یہ التزام کرلیا ہے کہ اگر رومی کو فتح دلوانی ہے تو اس کی بہادری اور شجاعت اور جنگ کے ہنروں کا بیان کیا جائیگا برخلاف اس کے اگر روسی کو غالب کرنا ہے تو اسی کی خونخواری اور زور آوری یکہ تازی بیان ہوگی اور مغلوب کا کام ایک ہی مصرعہ پر تمام ہو جائیگا۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو یہ کچھ خوبی نہیں ہے کہ ایک رخ گرم اور ایک رخ سرد رہجائے۔ گو نظامی کو سخنگوئی میں قدرت بلا کی ہے لیکن ان موقعوں کا نظامی نے بالکل خیال نہ کرکے اپنی شاعری کے دامن پر بدنما دھبہ لگایا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ اگر ہم مغلوب کی جان بازی اور بہادری نہ دکھائینگے اور اس کی شمشیر زنی کا نقشہ نہ کھینچینگے تو غالب کی کچھ عظمت نہ جمیگی۔ جنگ کا ہو بہو نقشہ کھینچ دینا یہ فردوسی ہی پر ختم ہوا ہے وہ دونو کے وار ایک دوسرے کے مقابلہ میں لکھتا ہے اور پھر عمدگی سے ایک جنگجو کو دوسرے جنگ آور پر غالب کردیتا ہے۔ کہ غلبہ کا شعر پڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص غالب آئیگا * مثلاً نظامی کہتا ہے *

ز روسی در آمد سوارے چو پیل	رخے چوں بقم چشمہائے چو نیل
بروں خواست از رومیاں ہمنبرد	ہمی کرد مردی ہمی گشت مرد
بدینگونہ خیلے بخوں در کشید	تنے چند را جاں زتن بر کشید
ز بس کشتن جنگ مرد آزمائے	نیامد کسے راسوئے جنگ رائے
چو روسی برومی براں دست یافت	زگوپال خود پیل را پست یافت
ہمی گشت پولاد ہندی بمشت	تنے چند رومی و چینی بکشت
چو بالائے نیزہ درازی گرفت	دراں معرکہ نیزہ بازی گرفت

ز پہلوئے لشکر گہ شہریار   بروں راند مرکب یکے شہسوار

نہ اسپے عقابے بر انگیختہ   نہ تیغے نہنگے در آویختہ

حریر تنش در قزاگند زرد   کلاہے ز پولاد چوں لاجورد

بمیداں در آمد چو عفریت مست   یکے حربۂ چار پہلو بدست

طریدی بر آورده با روس گفت   کہ خواہی ہمیں لحظہ در خاک خفت

ز ریوند مازندرانی منم   کہ بازی بود جنگ بانی منم

چو روسی درو دید در پیکرش   ز صفرا بگشتن در آمد سرش

شد آگہ کہ در کشت و ناورد داد   نباشد چناں مردمی مرد او

عناں سوئے لشکر گہ خویش داد   ہزیمت ہمی داد چوں تند باد

رہا کرد حربہ سوار دلیر   پس پشت او پشت برکرده شیر

گریزنده را حربہ خار پشت   بروں شد ز سینہ سناں خار مشت

ز تیزی کہ شد مرکبش باد پاے   رساند آں تن سفتہ را باز جاے

چو دیدند گاں اژدہائے نبرد   صلیبے کند صلب مرداں مرد

بر و خویش و بیگانہ بشتافتند   صلیبی شده کشتہ یافتند

ان اشعار میں نظامی نے کس بے مزگی سے روسی کو قتل کرایا ہے پہلے تو اسے اس قدر چڑھایا کہ بیسیوں کا اس کے ہاتھ سے خون کرا دیا اور اس کی بہادری ان پرجوش اور پرزور اشعار میں بیان کی کہ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسے بہادر کو مخنص گنتے کی موت مازندرانی کے ہاتھ قتل کرا دیا۔ اول تو اس بے بنیاد بندش نے لطف کھو دیا دوسرے ایسے ناممکن الوقوع واقعہ کا باندھنا جو کبھی ممکن نہیں ہو سکتا ایک خدائے سخن کے لئے سخت رکیک بات ہے اسی کے مقابلہ میں ہم فردوسی کے اشعار شیدہ اور کیخسرو کی جنگ کے یہاں لکھتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ فردوسی دو بہادروں کو کس طرح لڑاتا ہے۔ اور دونوں کو کیسا جانباز ثابت کرتا ہے (وھوھذا)؛

چو روشن شد آں چادر لاجورد　　جہاں شد بکردار یاقوت زرد

نشست از بر اسپ جنگی پشنگ　　ز باد جوانی سرش پر ز جنگ

بجوشن ہو شید روشن برش　　ز آہن کلاہ کیاں بر سرش

درفششش یکے ترک جنگی بچنگ　　خراماں بیامد بسان پلنگ

چو آمد بنزدیک ایراں سپاہ　　یکے نامدارے بشد نزد شاہ

کہ آمد سوارے میان دو صف　　خروشاں و جوشان و تیغے بکف

تو گوئی یکے اژدہائے دژم　　ہمی سوخت خواہد جہاں سا بدم

ہمی گوید آں نامور تیز چنگ　　کہ با شاہ گویند کامد پشنگ

بخندید از و شاہ و خفتان بخواست　　درخش بزرگی بر آورد راست

یکے ترک رومی بسر بر نہاد　　درفشش بہ ہام گودرز داد

ہمہ لشکرش زار و گریاں شدند　　چو بر آتش تیز بریاں شدند

خروشے بر آمد کہ اے شہریار　　باہن تن پاک رنجہ مدار

شہاں را ہماں تخت بودے نشست　　کہ بر کیں کمر بر میان تو بست

کہ جز خاک تیرہ نشینش مباد　　بہیچ آرزو کام و دستش مباد

سپہدار با گرز و با گبر و خود　　بہ لشکر فرستاد چندے درود

کہ یکتن نہ جنبد از آوردگاہ　　چپ و راست قلب و جناح سپاہ

نباید کہ جوید کسے جنگ و جوش　　بہ ہام و گودرز دارید گوش

چو خورشید بر چرخ گردد بلند　　بہ بینند تا بر کہ آید گزند

اگر زانکہ پیروز گردد پشنگ　　ز رستم بجوئید سامان جنگ

ہمہ پیش او بندہ فرماں شوید　　بداں دور نزدیک درماں شوید

سپہ را کہ چوں او نگہباں بود　　ہمہ چارۂ جنگ آساں بود

شما ہیچ دل را مدارید تنگ　　چنیں ست و آغاز و فرجام جنگ

گہے بر فراز و گہے بر نشیب　　گہے شادمان و گہے با نہیب

برانگیخت شبرنگ بهزاد را — که اندر نوشتی بتگ باد را
میاں بسته با نیزه و خود و گبر — همے گرد نعلش برآمد باببر
میان دو صف شیده او را بدید — یکے باد سرد از جگر برکشید
بدو گفت پور سیاوش توئی — خردمند و بیدار و خامش توئی
نبیره سپهدار توراں سپاهٔ — که شاید همے ترک بر چرخ ماهٔ
جز آنی که بر تو گمانے برد — جهاندیدهٔ کو خرد پرورد
که گر مغز بودیت با خال خویش — نکردی چنیں جنگ را دست پیش
اگر جنگ جوئی ز پیش سپاهٔ — برو دور بگزیں یکے جایگاه
کز ایران و توراں برہ بیند کس — نخواهیم یاراں فریادرس
چنیں داد پاسخ بدو شهریار — کہ اے شیر درنده کارزار
منم داغ دل پور آں بیگناه — سیاوش که شد کشته بر دست شاهٔ
بریں دشت از بہر آں کیں آمدم — نه از بهر گاه و نگیں آمدم
زپیش پدر چوں بیار استی — ز لشکر نبرد مرا خواستی
مرا خواستی کش نبودے روا — که پیشت فرستادمے ناسزا
کنوں آرزو کن یکے رزمگاه — که باشد بدور از میان سپاهٔ
نهادند پیماں که از هر دو روئے — بیاری نیاید کسے کینه جوے
هم ایشاں که دارند با ما درفش — زبد روز ایشاں نگردد بنفش
برفتند هر دو ز لشکر بدور — چناں چوں شود مرد شاداں بسور
رسیدند جائے که شیر و پلنگ — بداں شخ بے آب ننهاده چنگ
بیاباں که اندر خور رزم بود — بداں جایگه مرز خوارزم بود
نه پرید بر آسمانش عقاب — ازاں بهرهٔ سنخ و هم سراب
نهادند آوردگاهے بزرگ — دو جنگی بکردار درنده گرگ
سواراں چو شیراں جسته ز غار — که باشند پرخشم رد زشتکار

بگشتند با نیزہ ہاے دراز | چو خورشید تابندہ گشت از فراز

نماند ایچ بر نیزہ ہاشان سناں | پر از آب برگستوان و عناں

برومی عمود و بہ شمشیر تیز | بگشتند با یک دگر پر ستیز

ہوا شد زگرد سوران سیاہ | نگشتند سیر اندر آوردگاہ

چو شیدہ دل و زور خسرو بدید | سرشکش ز مژگاں برخ بر چکید

بدانست کاں فرۂ ایزدیست | ازو برتن خویش باید گریست

ہمہ اسپش از تشنگی شد غمی | نہ نیروے مرد اندر آمد کمی

چو زد تنگ شد با دل اندیشہ کرد | کہ گر شاہ را گویم اندر نبرد

بیا تا بکشتی پیادہ شویم | ز خون و خوے آہار دادہ شویم

پیادہ نگردد کہ عار آیدش | ز شاہی تن خویش خوار آیدش

بدیں چارہ گرزد نیابم رہا | شوم بیگماں در دم اژدہا

بدو گفت شاہا بہ تیغ و سناں | کند ہر کسے جنگ و پیچد عناں

پیادہ بر آید کہ جوییم جنگ | بکردار شیراں بیازیم جنگ

جہاندار خسرو ہم اندر زماں | بدانست اندیشہ بدگماں

بدل گفت کیں شیر بازور جنگ | نبیرہ فریدوں و پور پشنگ

گر آشفتہ گردد سرافشاں کند | بسے شیر دل را فروشاں کند

دگر من پیادہ بگردم بجنگ | با یرانیاں بر کند کار تنگ

بدو گفت رہام کاۓ تاجور | بدیں کار تنگی مگرداں دگر

چو خسرو پیادہ کند کارزار | چہ باید بریں دشت چندیں سوار

اگر پاۓ بر خاک باید نہاد | من از تخم کشواد دارم نژاد

پیادہ شوم پیش او رزم ساز | تو شاہے جہاندار و گردن فراز

برہام گفت آنزماں شہریار | کہ اے مہرباں پہلواں و سوار

پشنگ دلاور ز تخم پشنگ | چنیں داں کہ با تو نیاید بجنگ

ترا نیز با رزم او پائے نیست ‏ ‏ ز ترکاں چنیں لشکر آرائے نیست

نباشد مرا ننگ رفتن بجنگ ‏ ‏ پیادہ بسازیم چنگ پلنگ

وزاں سو بر شیدہ شد ترجماں ‏ ‏ کہ دوری گزیں زاہد بدگماں

جز از بازگشتن ترا رائے نیست ‏ ‏ کہ با جنگ خسرو ترا پائے نیست

بہ ہنگام گردن ز دشمن گریز ‏ ‏ بہ از باتن خویش کردن ستیز

بداں نامور ترجماں شیدہ گفت ‏ ‏ کہ آواز مرداں نشاید نہفت

چناں داں کہ تا من بہ بستم کمر ‏ ‏ ہمے برفرازم بخورشید سر

بدیں زور و ‏ ‏ با فرۂ و دستبرد ‏ ‏ ندیدم با ورد گہ نیز گرد

ولیکن ستوداں مرا از گریز ‏ ‏ بیاید چو گیرم بکارے ستیز

ہم از گردش چرخ بر نگزریم ‏ ‏ اگر دیدۂ اژدہا بسپریم

گرآید مرا ہوش بردست اوست ‏ ‏ نہ دشمن زمن باز دارد نہ دوست

ندانستم ایں زور مردی زچیست ‏ ‏ بریں نامور فرۂ ایزدیست

پیادہ مگر دست یابیم بدوے ‏ ‏ بہ پیکار خوں اندر آیم بجوے

چنیں گفت با شیدہ شاہ جہاں ‏ ‏ کہ اے نامدار از نژاد مہاں

زتخم کیاں ہیچماں کس نبود ‏ ‏ کہ ہرگز پیادہ نبرد آزمود

ولیکن ترا گر چنیں ست کام ‏ ‏ ز کام تو ہرگز نہ پیچم لگام

فرود آمد از پشت شبرنگ شاہ ‏ ‏ زسر برگرفت آں کیانی کلاہ

برہام داد آں گرانمایہ اسپ ‏ ‏ بیامد بکردار آذرگشسپ

چو از دور دیدش پیادہ پشنگ ‏ ‏ فرود آمد از اسپ جنگی نہنگ

بہاموں چو پیلاں برآویختند ‏ ‏ ہمے خاک با خون برآمیختند

چو شیدہ بدید آں برہ زور شاہ ‏ ‏ ہماں ایزدی فر و آں دستگاہ

ہمے جست چارہ کہ یابد رہا ‏ ‏ دل چارہ گر زیں بسازد بہا

چو آگاہ شد خسرو از راز وے ‏ ‏ وزاں نابرآوردہ آواز وے

بزور جہاں آفریں کردگار | بزد دست کیخسرو نامدار
بکردار شیریکہ بر گور نر | زند چنگ گور اندر آرد بسر
گرفتش بچپ گردن راست چپ | برآورد و زد بر زمیں بر دتپ
ہمہ مہرہ پشت او ہمچو نے | شد از دور ریزان و بکشست پے
یکے تیغ تیز از میاں برکشید | سراسر دل نامور بر درید

بروکرو جوشن ہمہ چاک چاک
پس انگاہ برتار کش ریخت خاک

ان دونوں فضلا کے طرز بیان سے یہ بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ فردوسی جس خوبی اور عمدگی سے جنگ کی ایک ادنےٰ ادنےٰ بات کا فوٹو اتارتا ہے نظامی میں کیا تو یہ قدرت نہیں تھی کہ وہ کل واقعات کا نقشہ کھینچ سکتے یا انہوں نے خود اس ڈھنگ کو پسند نہیں کیا۔ کچھ ہو غرض یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ جو قدرت اور طاقت اور زور اور ڈھنگ کہ فردوسی نے حاصل کیا تھا نظامی میں وہ صفت نہ تھی گو میں فصاحت وبلاغت کی نسبت کوئی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا لیکن اس قدر ضرور رائے دونگا کہ جو فصاحت فردوسی کی کلام میں ہے نظامی کے کلام میں فصاحت کا وہ وزن نہیں ہے اب میں دوسرے رنگ کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتا ہوں اور وہ نامہ نویسی کا رنگ ہے مجھے یہ دکھانا ہے کہ نظامی جب ایک شاہ کو دوسرے شاہ کی طرف سے لکھتا ہے تو کونسا پہلو اختیار کرتا ہے اور کہاں تک واقعات کی پیروی کرتا ہے اور فردوسی کی نامہ نویسی کا اس کے مقابلہ میں کیا رنگ ہے ٭

نظامی نے ہر جگہ واقعات میں بہت غلطی کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کو تاریخ کا بہت کم علم تھا۔ آتش پرستوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ ہر چیز کے پہلے بسم اللہ کے طور پر خدا کا نام لکھا کرتے تھے لیکن خصوصاً زیادہ

قران ہی ناموں کے پہلے یہ مبارک نام لکھا جاتا تھا کہ جو مذہبی ہوتے مثلاً کتاب وساتیر کے پہلے بخشانیدہ کا نام مبارک تحریر ہے یاجب سکندر نے ایران فتح کیا ہے اور وہ مداین تک پہنچ گیا ہے تو اس کے لئے جو نامہ تیار ہوا تھا اس کے پہلے بھی بسم اللہ لکھی گئی تھی۔ بت پرستوں میں یہ کہیں دستور نہ تھا کہ اگر اہم نامہ وپیام ہو تو پہلے خدا کا نام ہو ہاں یہ ضرور تھا کہ مذہبی پیشوا اپنی کتابوں اور مصنفہ رسالوں میں صرف دیبیوں کی تعریف کے چند اشعار لکھدیتے تھے۔ مگر جس روش کو کہ نظامی نے نامہ نویسی میں اختیار کیا ہے یہ یونانی بت پرست قوم میں جس میں سکندر تھا رائج نہ تھی نظامی نے بالکل اسلامی طریقہ اختیار کیا ہے سکندر کی قوم اور ملک کی معاشرت سے انہوں نے کچھ سروکار نہیں رکھا فردوسی میں یہ بات نہیں ہے اول تو وہ مشکل سے نامہ کی ہیڈنگ میں ایک آدھ حمدیہ شعر لاتا ہے اور وہ بھی نامہ لکھنے والے کے مذہب کے مطابق زیادہ تمہید ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ پسند ہی نہیں کرتا۔ جو داستان اس نے شروع کی ہے بس ایک آدہ معمولی شعر لکھ کر شروع کردی ہے۔ تمہید کو پرتکلف بناکر نہیں دکھایا نہ اس مشرقی ہومر کا یہ مذاق تھا +

نظامی کی نامہ نویسی میں پولیٹکل پہلو بہت کم ہوتا ہے یعنے جب وہ کسی شاہ کی طرف سے کوئی نامہ لکھتے ہیں تو اس میں نہ اکثر بیونت ہوتی ہے نہ ملکی معاملات کی پیچیدگی مضمر ہوتی ہے اور نہ سلطنت کا اتار چڑھاؤ پیچ درپیچ عبارت میں دکھایا جاتا ہے۔ نظامی اس صفائی سے سلطنت کے معاملات کو لکھتے ہیں کہ جیسے ایک ناتجربہ کار گرانڈیل جوان میدان کارزار میں الٹے سیدھے ہتھیار چلاتا ہے اور اپنے تجربہ کار دشمن کے آگے اپنی جہالت کو اپنی قوت کے بل پر چھپانا چاہتا ہے فردوسی میں یہ بات نہیں ہے وہ جب ایک شاہ سے دوسرے شاہ کو نامہ لکھتا ہے تو وہ پیچیدہ باتیں مکروفریب کی جو پولٹیکل معاملات اور ملکی انتظامات کی جان ہیں ایسی چٹکیوں میں بیان کرجاتا ہے کہ قائل کا اصلی عندیہ نہیں معلوم ہوسکتا اگر کوئی

شخص نامہ لکھنے والے کا حال پہلے نہ دیکھے اور صرف اسی نامہ پر اس کا حال جاننا چاہیئے تو محض ناممکن ہے کہ اس کی اصلی حالت سے ذرا بھی آگاہ ہو سکے۔ مثلاً جب افراسیاب کی بیرحمیاں حد سے گذر گئیں اور اس نے محض اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہمیشہ شکستوں پر شکستیں کھائیں اور آخرکار اس کے تمام رشتہ دار اور بڑے بڑے جان نثار جنرل جو اس کے درحقیقت بہت بڑے قوت بازو تھے میدان کارزار میں ایرانیوں کے مقابلہ میں مارے گئے تو اس نے آخرکار اپنے نواسے کو جو تخت ایران پر جلوہ افروز تھا اور جس کے باپ سیاوش کو (یعنے اپنے داماد کو) فریب اور بیرحمی سے قتل کر چکا تھا اور نواسا اپنے باپ کے خون بہا اپنے نانا کی جان لینے پر آمادہ تھا تو ایسی حالت میں افراسیاب نے اسے ایک ایسا بیم و رجا کا نامہ لکھا اور وہ مضمون اس میں تحریر کیا کہ جس نے افراسیاب کی گذشتہ عہد شکنیاں نہ دیکھی ہوں اور اس کی ناقابل برداشت بیرحمیوں کا حال نہ سنا ہو وہ افراسیاب کے نامہ کے مضمون پر یہ رائے قایم کر سکتا ہے کہ افراسیاب محض بے گناہ ہے اور کیخسرو یعنے اس کا نواسا بڑا سنگدل ہے۔ یہی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ نہ کہ مضمون ایسا ہو کہ جیسے گنوار کا لٹھ ہوتا ہے کہ صاف صاف ہر بات آشکارا ہوتی چلی جائے۔ گو نظامی نے بھی اس نامہ میں جو خاقان چین کی طرف سے سکندر کو لکھا ہے پیچیدہ پولٹیکل مضامین کے بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس عمدگی سے بیان نہ کر سکے کہ جیسے فردوسی بیان کرتا ہے ہم دونوں کے نامے یہاں درج کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جائیگا کہ آیا نظامی نے نامہ لکھنے کا جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ پسندیدہ ہے یا فردوسی نے جو پولٹیکل چال نامہ لکھنے میں پسند کی ہے وہ قابل وقعت ہے پہلے سکندر کا نامہ کید ہندی کو تحریر کیا جاتا ہے جو نظامی نے لکھا ہے:

پس از نام دارندۂ مہر و ماہ	کہ اندیشہ را سوئے او نیست راہ
خداوند فرمان و فرماں بہراں	فرستندۂ وحی پیغمبراں

بفرمان اورنگ چرخ کبود — بسے داد بر نیک نامان درود
سخن راند انگہ کہ اے پہلواں — کہ پشت قوی باد و بخت جواں
براں بود رایم کہ عزم آورم — بگوپال با پیل رزم آورم
نمایم بگیتی یکے دستبرد — کہ گرد و زپولاد من کوہ خرد
بہندوستاں در زنم آتشے — ندارم دراں بوم گردن کشے
کمند افگنم بر سر زندہ پیل — زخوں ہیچ روئیں برآرم زنیل
ہمہ خاک او را بخوں تر کنم — ہمہ آب رو خاک بر سر کنم
چو تو روے در آشتی داشتی — عناں بر نہ پیچیدم از آشتی
بشیریں سخن ہائے جاں پرورت — خداوند بودم شدم چاکرت

اسیطرح سے سکندر نے کیدرائے ہندی کو لکھا ہے۔ نہ نامہ ہے نہ نامہ کی شان ہے کچھ طرزہی نامہ نویسی کی نہیں پائی جاتی ساری بے بہا گو باتیں ہیں جیسی کوئی اکھڑی اکھڑی گفتگو کر رہا ہے۔ یا منہ در منہ جنگ کے وقت جلدی میں جواب وسوال ہو رہے ہیں اس گفتگو سے جو میدان کارزار کی نظامی نے لکھی ہے اور اس نامہ کی طرز تحریر سے ذرا بھی فرق نہیں ہے اس سے پہلے نظامی نے سکندر کا وہ نامہ تحریر کیا ہے جو ہندوستان پہنچتے ہی اس نے کیدرائے ہندی کو بھیجا تھا۔ جو درج ذیل ہے:

جریدہ یکے قاصد تیز گام — فرستاد و دادش بہ ہندو پیام
کہ گر جنگ داری برون کش سپاہ — کہ اینک رسیدم چو ابر سیاہ
دگر بر پرستش میاں بستۂ — چناں داں کہ از تیغ من رستۂ
سر نرگس آنگہ برآید ز خواب — کہ ریزد بر و ابر بارندہ آب
گل آنگہ عماری در آرد بباغ — کہ خورشید ما گرم گردد دماغ
بجوشم بجوشد جہاں از شکوہ — بجنبم بجنبد ہمہ دشت و کوہ
بجائے بخسپد عقاب دلیر — کزانجا تواں ہشتن او را بزیر

گر انجا ز سر موے انگیختہ است | بدینجا سراز موے آویختہ است
دگر ہست کوہے شما تیغ دار | کنند تیغ من کوہ را غار غار
گراز بہر گنج آرم انجا فریش | بمغرب ز زر مغربی ہست بیش
گرم ہست برخو برویاں شباب | بخوار زم روشن تراز آفتاب
جواہر بخویم دریں مرز و بوم | کزیں مایہ بسیار دارم بروم
نہند آدم تیغ ہندی بدست | کباب ترم باید از پیل مست
مخور عبرۂ ہند بے یاد من | کہ ہندی تراز لنت پولاد من
چو سربایدت سرمتاب از خراج | دگر نے نہ سر باتو ماند نہ تاج

نظامی کے اس نامہ پر اگر منصفانہ نظریں ڈالی جائینگی تو یہ کھل جائیگا کہ نظامی کو نامہ لکھنے کا ڈھنگ اچھا نہ آتا تھا اب اگر ایک شاہ کسی شاہ کو ایسی لغو مثالیہ باتیں لکھے تو اس کی وقعت ایک مجنوں سے زیادہ نہ بچے گی اس طرز تحریر کے علاوہ واقعہ پر خیال کریں تو یہ صحیح نہیں ہے کجا کیدرائے ہندی اور کجا مہاراجہ ہند اگر نظامی کچھ بھی سکندر کی تاریخ سے واقف ہوتے تو انہیں یہ ضرور معلوم ہوتا کہ جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے اس وقت ہندوستان آٹھ سو خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو رہا تھا ان آٹھ سو میں ہر راجہ خود مختار اور آزاد تھا۔ چنانچہ ان میں ایک پورس بھی تھا جو گجرات پر سکندر سے کئی خونریز میدان لڑا تھا پھر ہمیں نہیں جانتا کہ کید ہندی ان آٹھ سو میں کونسا راجہ تھا ہمارے ناظرین شاید اس اعتراض پر یہ کریٹی سائز کریں کہ سکندر نامہ کوئی تاریخ تھوڑی ہی ہے کہ اس پر فیکٹس کے اعتراض ہوئے ہیں وہ تو کمال مشرقی شاعری کا ایک نمونہ ہے تاہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اگر واقعات صحیح ہوتے تو کمال شاعری میں کچھ فرق ہو جاتا؟ یا مشرقی نظم کی بیوٹی کم ہو جاتی؟ نہیں ہر گز نہیں؟ اس کی بیوٹی میں بھی کبھی کوئی نقص نہ آسکتا تھا بلکہ اور دوناحسن ہو جاتا اور عجیب و غریب تاریخ نظم میں پائی جاتی۔ اگر ہم اس تاریخی نکتہ چینی کو بالکل واپس

لے لیں اور ہرگز اس کا خیال بھی نہ کریں بلکہ سکندر نامہ مشرقی شاعری کا ایک کامل نمونہ سمجھیں پھر بھی تو نظامی کے طرز بیان پر بہت بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ اس نے ہر موقعہ پر اسی کے مناسب حال جب معضا میں لانے کی کوشش کی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ نامہ کی تحریر اور میدان کارزار کی زبانی گفتگو کو بالکل بلادیا۔ پھر سب سے زیادہ یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ سکندر بت پرست تھا اس کی طرف سے جو نامہ نظامی نے لکھا ہے اس میں پیغمبروں اور وحیوں کا ذکر ہے یہ باتیں صریح فاضل شاعر کی لاعلمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اچھا ہم اس غلطی کو بھی نہ دیکھیں اور اسے بھی حسن کلام میں داخل کرلیں جب بھی نامہ کی طرز تحریر ہمیشہ کھٹکتی رہے گی جس کا پیمانہ کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ اب میں فردوسی کا وہ نامہ درج کرتا ہوں جو افراسیاب کی طرف سے جس کا ذکر میں اوپر کرآیا ہوں کیخسرو کو لکھا گیا ہے۔ اس نامہ سے یہ معلوم ہوگا کہ افراسیاب نے کن پر مکرو فریب پہلوؤں سے اپنی اصلی حالت بھی چھپائی ہے اور اپنی محبت اور ایک رحیم شاہ کی بے مروتی اور ظلم ثابت کیا ہے اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں گھبراہٹ اور پریشانی پائی جائے کس متانت اور سنجیدگی سے پیچیدار پولٹیکل چال کو نظم میں لکھتا ہے ÷

بکیخسرو از من پیامے رسان	بگویش کہ گیتی دگر شد بسان
نبیرہ کہ جنگ آورد با نیا	سرش بر بدی باشد و کیمیا
چنیں بود رائے جہاں آفریں	کہ گردد جہاں پر ز پرخاش و کیں
سیاوش نہ بیہودہ کشتہ شد	از آموزگاران سرش گشتہ شد
گنہ گر مرا بود پیراں چہ کرد	چہ رویئں دل ہاک فرشید ورد
کہ بر پشت اسپاں بپائیست لبت	پر از خوں بکرد از سپاہاں مت
در ایدر دنگہ گوئی کہ تو بدتنی	بد اندیش و از تخم اہرمنی
تو ایں کیں بگو در زو گناہ رس پال	کہ پیش من آمد لشکر جمال

تو خویشی و ایشاں مرا دشمنند — بماں تا ہمی جنگ ایشاں کنند

نہ زاں گفتم ایں کز تو ترساں شدم — دگر پیر گشتم ہراساں شدم

ہمہ ریگ دریا ہمہ لشکر اند — ہماں نرہ شیران و کند آورند

ہر آنگہ کہ فرماں دہم کوہ کنگ — چو دریا کنند اے پسر روز جنگ

ولیکن ہمے ترسم از کردگار — ز خوں ریختن وز بد روزگار

کہ چندیں سر نامور بیگناہ — جدا گردد از تن بریں رزمگاہ

گر از پیش من برنگردی بجنگ — ہمانا کہ آیدت ازیں کار ننگ

چو با ما بسوگند پیماں کنی — بکوشی کہ پیماں ما نشکنی

بمیں کار باشم ترا رہنمائے — کہ گنج و سپاہت بماند بجائے

چو کار سیاوش فرامش کنی — نیارا بتوراں سیاوش کنی

برادر بود جہن و جنگی پشنگ — کہ در جنگ دریا کنند کوہ کنگ

ہر آں بوم و برکاں ز ایراں نہی — بفرماں کنم آں ز ترکاں تہی

ز گنج نیاکاں مرا ہر چہ ہست — ز دنیا رو از تاج و تخت نشست

ز اسپ و سلیح و ز بیش و ز کم — کہ میراث ماند از نیا زادشم

ز تاج بزرگان و تخت و کلاہ — ز چیزے کہ خواہی ز بہر سپاہ

فرستم ہمہ ہمچنیں پیش تو — پسر پہلواں و پدر خویش تو

دو لشکر برآساید از رنج رزم — ہماں رزم ما باز گردد بہ بزم

درآید دل کہ جاں ترا اہرمن — بہ پیچد ہمے تا بپوشی کفن

جز از رزم و خوں کردنت رائے نیست — بمغز تو پند مرا جائے نیست

تو از لشکر خویش بیروں خرام — من از جائے خود ہم نہم پیش گام

بگردیم ہر دو باوردگاہ — برآساید از جنگ ہر دو سپاہ

چو من کشتہ گردم جہاں پیش تست — سپہ بندگان و پسر خویش تست

دگر تو شوی کشتہ بر دست من — کسے را نیازارم از انجمن

سپاہ تو در زینہار من اند — ہمہ مہتر انند و بار من اند
دگر با من ایدر نیابی بجنگ — نتابی تو با کار دیدہ نہنگ
پدر پیر شد پائے مردش جواں — جوانے خردمند روشن رواں
باوردگہ با تو جنگ آورد — دل شیر و چنگ پلنگ آورد
نہ بینیم برتا کہ گردد سپہر — کرا بہ نہد بر سر از تاج مہر
ورا ایدواں کہ با او بخوبی نبرد — دگر گونہ خواہی ہمی کار کرد
بماں تا بیا ساید امشب سپاہ — چو بر سر نہد کوہ زریں کلاہ
شب تیرہ زود امن اندر کشید — یکے چادر شعر بر سر کشید
ز لشکر گزیں نیم جنگ آوراں — سرافراز با گرز ہائے گراں
زمیں را ز خوں رنگ و یبا کنیم — ز بالائے بدخواہ پہنا کنیم
دوم روز ہنگام بانگ خروس — نہ بندیم بر کوہ ہٹ پیل کوس
سراں را بیاری بروں آوریم — بجوئی اندروں آب خوں آوریم
بزرگان ایران و توران زمیں — بجویند با یکدگر رزم و کیں
سوم روز لشکر بکردار کوہ — در آریم و در رزم و کیں ہمگروہ
بہ بینیم تا ایں سپہر بلند — کرا خوار دارد کرا ارجمند

فردوسی کی اس نامہ نویسی کے ڈھنگ سے یہ ضرور ظاہر ہو گیا ہوگا کہ جو طرز نظامی نے اختیار کی ہے وہ اس کے مقابل میں زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اب میں فردوسی اور نظامی کے اس مقام کو نقل کرتا ہوں جہاں دونوں نے نصیحت کی ہے تاکہ فاضل شعرا کی نصیحت کا ڈھنگ بھی معلوم ہو جائے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مشرقی اور ٹیرس اور شعرا میں سعدی سے بہتر ناصح کوئی نہیں ہوا لیکن ہمیں یہاں صرف نظامی اور فردوسی کا وزن دیکھنا ہے اس لئے ہمارا روئے سخن بھی ان ہی دو فاضل شعرا کی طرف ہے اور سعدی سے یہاں غرض نہیں ہے چنانچہ نظامی لکھتا ہے *

بیا تا ز بیداد شوئیم دست | کہ بیداد نتواں ز بیداد رست
چہ بندیم دل در جہاں سال و ماہ | کہ ہم دیو خانہ است ہم غول راہ
جہاں دام خویش از تو یکسر بود | بجرعہ فرستد بساغر برد
چو باراں کہ یک یک مہیا شود | شود سیل و آنگہ بدریا شود
بیا تا خوریم آنچہ داریم شاد | درم بر درم چند باید نہاد
نہنگے بما بر گذر کردہ گیر | ہماں گنج نا خوردہ راتو بنہ گیر
ازاں گنج کاور دقاروں بدست | سر انجام در خاک بیں چوں نشست
چہ باید نہادن دریں خاک دل | کز و گنج قارون فروشد بگل
ازاں خشت زریں شداد و عاد | چہ آمد بجز مردن نا مراد
دریں باغ رنگیں درختے نہست | کہ ماند از قضائے تبر زن درست

ان اشعار میں نظامی نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ کر اپنے مشرقی رنگ کی نصیحت کو کام فرمایا ہے اس سے غرض یہ ہے کہ جو کچھ پاس ہو کھاؤ پیو اور مزے کرو اور اپنے سر پر قضا کی چیل منڈلاتی ہوئی تصور کر لی جائے بظاہر یہ نصیحت نہایت پیارے اور پر اثر الفاظ میں معلوم ہوتی ہے لیکن پولیٹکل ایکانمی سے اس کا درجہ بہت دور ہے بلکہ انسانی تمدنی حالت کا خون کرنے والی ہے کیا مرہٹی گو نظیر اکبر آبادی کے اس شعر سے ان شائستہ اشعار کا زیادہ مفہوم ہے ؟

چکھ ڈال مال دھن کو کوڑی نہ رکھ کفن کو
جس نے دیا ہے تن کو دیگا وہی کفن کو

اس میں شک نہیں کہ نظامی کی اس قماش کی نصیحت کا ایک ایک لفظ ساتھ ساتھ جس کے وہ زمانہ کا نقشہ بھی کھینچتے جاتے ہیں ایسا دل میں آپ سے آپ کھبا چلا جاتا ہے کہ ایک عجیب ہی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس کی اندرونی فطرت پر خیال کیا جاتا ہے تو اعلےٰ مطالب سے محض خالی خولی معلوم

ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں فردوسی لکھتا ہے +

بگرد دروغ ایچ گونہ مگرد — چو گردی بود بخت را روے زرد

دل و مغز را دور دار از شتاب — خرد با شتاب اندر آید بخواب

بہ نیکاں گرائی بہ نیکی بکوش — بہر نیک و بد پند دانا نیوش

نباید کہ گرد بگرد تو بد — کہ از بد نژا بیگماں بد رسد

ہمہ پاک پوش و ہمہ پاک خور — ہمہ پندہا یاد گیر از پدر

بہ یزداں پناہے بہ یزداں گرائے — چو خواہی کہ باشد ترا رہنمائے

جہاں را چو آباد داری بداد — بود گنج آباد و بخت تو شاد

چو نیکی نمایند پاداش کن — مماں تا شود رنج نیکاں کہن

ہنر مند را شاد و نزدیک دار — جہاں را بد اندیش تاریک دار

بہ ہر کار با مرد دانا سگال — برنج تن از بادشاہی منال

ہر آنکس کہ باشد ترا زیر دست — مفرمائے در بینوائی نشست

بزرگان و آزادگان شہر — ز نیکیست باید کہ یابند بہر

ز نیکی فرومایہ را دور دار — بہ بیداد گر مرد بگذار کار

ہمہ گوش و دل سوے درویش دار — غم کار او چوں غم خویش خوار

چو از خویشتن نامور داد داد — جہاں گشت از و شاد این نیز شاد

برارزانیاں گنج بستہ مدار — بہ بخشائے بر مرد پرہیزگار

درِ امید و نکہ دشمن شود دوستدار — بشورہ زمیں تخم نیکی مکار

گر این پند ما را شوی کاربند — ہمیشہ کلاہت بماند بلند

کہ نیکی و ہش نیک خواہ تو باد — خرد تخت و دولت کلاہ تو باد

مبادت فراموش گفتار من — وگر دور مانی ز دیدار من

سرت سبز بادا دلت شادماں — تن پاک دور از بد بدگماں

ہمیشہ خرد پاسبان تو باد — ہمہ نیکی اندر گمان تو باد

چو من بگذرم زیں جہان فراخ | برآورد باید مرا خوب کاخ
بجائے کزو دور باشد گزر | نہ پرد براو کرگس تیز پر

سرآورہ برچرخ گرداں بلند
ببالا فزوں باید ازدہ کمند

ان اوپر لکھے ہوئے فردوسی کے اشعار سے اس کی نصیحت کا وزن معلوم ہو گیا ہو گا دنیا میں جو چیزیں ایسی ضروری ہیں کہ جو دین و دنیا میں کام آنے والی ہیں ان ہی کے حاصل کرنے کی سادہ الفاظ میں نصیحت کی ہے۔ بڑی بڑی اخلاق اور علم تمدن کی کتابیں ان ہی بیش بہا نصایح سے بھری پڑی ہیں لیکن ان طول طویل تحریروں کے دیکھنے اور ان کے ذہن میں جمانے کے لئے بہت بڑا وقت چاہئے مگر میں فخر سے کہ سکتا ہوں کہ فردوسی نے چند اشعار میں بڑے پولیٹکل ایکانمی کے مطالب کو ادا کیا ہے اور وہ پیاری پیاری ضروری ضروری نصایح کی ہیں کہ جو ہر مذہب والے حتّے کہ دہریہ کو بھی لازمی ہیں اور بغیر ان صفات کے جن کی طرف فاضل شاعر خیال رجوع کرانا چاہتا ہے انسان انسان نہیں بن سکتا۔

جو کچھ میں نے مقابلہ میں دو فاضل شعرا کے اشعار پیش کئے ہیں امید ہے کہ ان پر زیادہ غور کی جائے گی اور ان ریمارکس کو بغور دیکھا جائیگا جو میں نے اپنے کانشنس کے مطابق نظامی کے اشعار پر کئے ہیں۔ اس سے میری غرض نظامی پر حملہ کرنے کی نہیں ہے بلکہ گنجہ اور شاداب کے رنگ کا مقابلہ کرنا ہے رہا نظامی کے بعض اشعار پر محض اپنی نیک نیتی سے کریٹی سایز کرنا یہ کوئی گناہ نہیں ہے شاید پرانے خیالات کے میانجی جو بچوں کو گلستاں بوستان اور بڑا تیر مارا تو سکندر نامہ پڑھاتے پھرتے ہیں میری اس تحریر کو دیکھ کر جیں بجبیں ہوں لیکن مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے اور میں اپنے رب سے یہ التجا کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب ان کے ہاتھ میں جائے ہی نہیں۔ میں نے یہ کتاب صرف ان ہی

تازہ خیال نوجوانوں کے لئے لکھی ہے کہ جو کوئی نئی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو رہے ہیں۔ اور انہیں ہمیشہ نئی طرز میں دلچسپی ہوتی ہے جب وہ دیکھینگے تو انہیں یہ معلوم ہوگا کہ گو نظامی بھی مشرقی شاعری کا ایک بہت بڑا اعلیٰ نمونہ ہے مگر پھر بھی وہ کسی رنگ میں فردوسی کو نہیں پونچھا۔ ہاں تمہید اٹھانے اور اس کو زور شور سے باندھنے میں بے شک فردوسی سے بہتر ہے +

سکندر نامہ اور شاہ نامہ میں علاوہ اس فرق کے جو ہم نے بیان کیا ایک بہت بڑا ابل اور بھی ہے اور وہ واقعات کا غلط ہونا ہے شاہ نامہ میں اگر شاعرانہ رنگ کو اڑادیں تو ہمیں فیکٹس اکثر صحیح اور ناقابل اعتراض ملینگے مگر سکندر نامہ میں یہ بات نہیں ہے اس میں فیصدی ایک بات بھی بمشکل صحیح ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظامی نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سکندر کی نسبت سنا لکھ دیا افسوس زمانہ نے یونانی تواریخ دیکھنے کے لئے انہیں موقع نہ دیا کہ پھر وہ ہر جگہ یہ غلط بیانیاں نہ کرتے +

جس نے سکندر کی سوانح عمری یا اس کی تاریخ دیکھی ہے وہ کہسکتا ہے کہ جو کچھ اس کی بابت سکندر نامہ میں لکھا ہوا ہے شاید ہی کوئی ایک بات صحیح ہو اور نہیں ساری باتیں محض خیالی ہیں +

ان تمام باتوں کو چھوڑ کر اگر ہم محض شاعری کو دیکھیں تو ہم بے ساختہ یہ کھینگے کہ جیسے فردوسی اپنے رنگ میں لاثانی ہے اسی طرح نظامی بھی اپنے رنگ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اور ہم برملا دونوں کی محض شاعری پر یہ نہایت مختصر ریمارک کرسکتے ہیں +

کلام سخنداں دانائے طوس	بخوبی برآراستہ چوں عروس
کلام نظامی چو گل در چمن	چہ مشاطہ بہر عروس سخن

یکے ہست آدم کہ در عہد او | نکردی کسے از سخن گفتگو
دگر شاعری کردہ سحر رقم | درستے مضموں شکستے قلم
نظامی فرستادۂ آفریں | سخندان اول بدور پسیں
بود ہمچو عیسےٰ مسیحا زماں | دمیدہ است جاں در تن کشتگاں
دو شاہاں ملک سخن یک کلاہ | دو چشم ست اما دو را یک نگاہ
دو طوطی قدس است در یک قفس | دو آواز پیداست از یک جرس
دو بلبل بیک باغ نغمہ سرا | بیک سرو دو طوطی خوش نوا

فصاحت بفردوسی آمد غلام
بلاغت بہ نظم نظامی تمام

تمام شد

